راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 18واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

ماہنامہ ارژنگ لاہور

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی

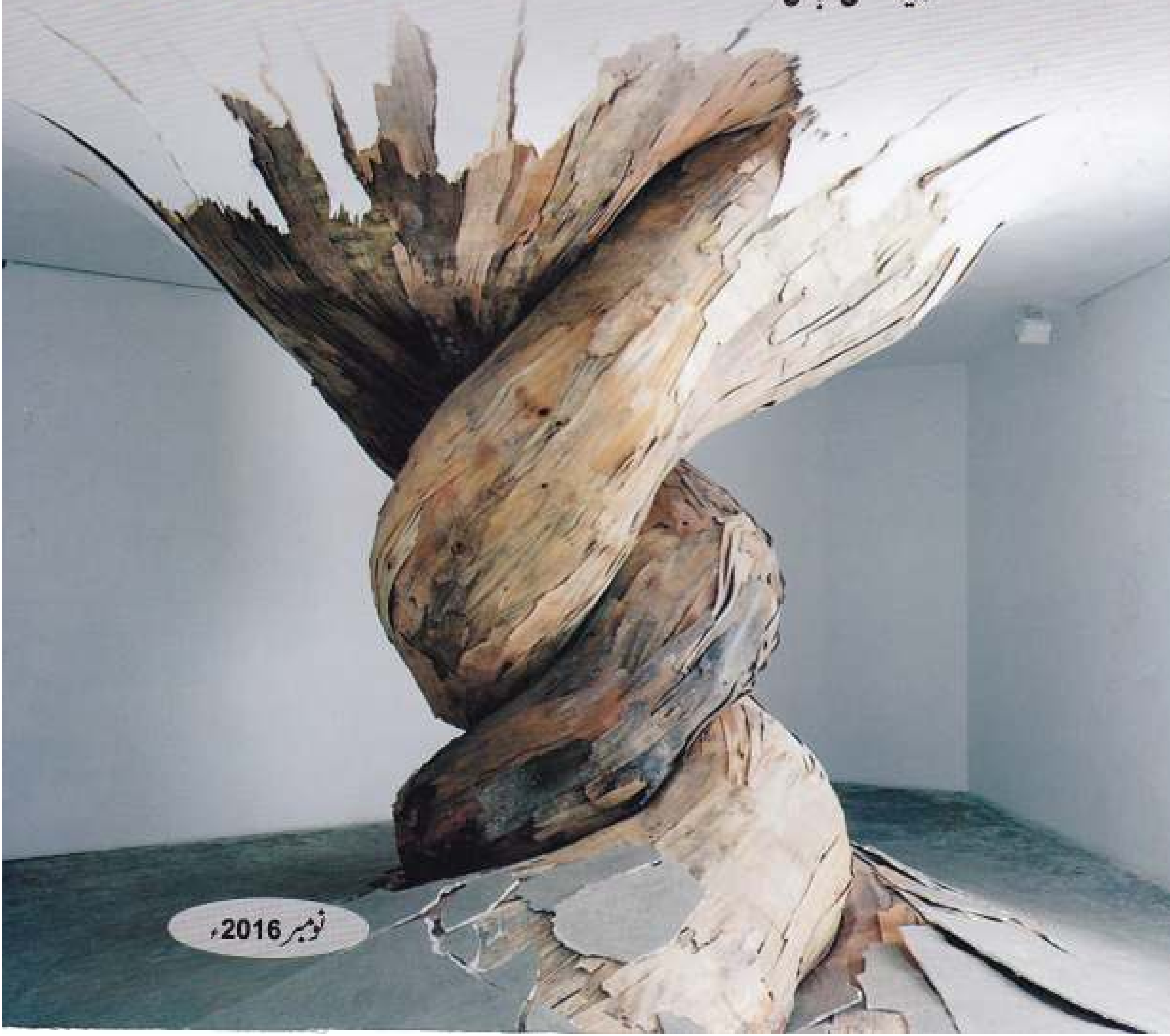

نومبر 2016ء

فوج اور سول بیوروکریسی نے زندگی میں نظم وضبط پیدا کرنے کا ہنر سکھایا ہے۔

پاکستانی ادب یقیناً ہماری تہذیب ثقافت اور معاشرت کا ترجمان ہے۔

شاعری میری محبت ہے اور محبت لمحاتی احساس کا نام نہیں ہے۔

نامور ادیب اور ایگزیکٹو ڈائریکٹر کیپٹن (ر) عطاء محمد خان سے عامر بن علی اور حسن عباسی کی گفتگو

سرکاری سرپرستی میں ہونے والے مشاعروں کی بہت اہمیت ہے۔

ارژنگ: کب اور کیسے خیال آیا کہ لکھنا چاہئے۔

عطامحمد خان: شعر کہنے میں میرے بڑے بھائی راؤ اختر علی خان (مرحوم) کا بڑا حصہ تھا۔ وہ اکثر شعر کا پہلا مصرعہ پڑھتے اور دوسرا سننے کی فرمائش کرتے۔ اس طرح آہستہ آہستہ طبیعت اس طرف راغب ہوئی اور مسلسل اس بات کی تحریک ہوئی کہ شعر کہے جائیں۔ اس کے علاوہ گھر کا ماحول بھی ادبی تھا۔ گھر کی فضا میں اکثر اوقات اشعار اور مصرعے گونجتے رہتے تھے۔ ان کے بعد راؤ افتخار خان بھائی جو اس وقت میرے کافی قریب ہیں اور زرعی یونی ورسٹی فیصل آباد میں ڈین فیکلٹی آف ایگریکلچر ہیں۔ ان کے شعری اور ادبی ذوق نے بہت متاثر کیا۔ صحیح معنوں میں سکول کے زمانے کے استاد ماسٹر غلام محمد وہ شخصیت ہیں جنہوں نے میرے شعری ذوق کی آبیاری کی۔ وہ خود بھی اچھے شاعر ہیں اور غالب کے رنگ میں غزلیں کہتے ہیں۔ ماسٹر صاحب کے ساتھ ہی ادبی محفلیں برپا ہوتی تھیں۔ انہی محفلوں کی وجہ سے شعر کہنے کا شوق مزید بڑھا۔ شروع میں ابتداء کے طور پر اصلاح بھی ماسٹر صاحب سے ہی لی۔

ارژنگ: ابتدائی زندگی کب اور کہاں کیسے گزری۔

عطامحمد خان: 13 اکتوبر 1958 کو عارف والا کے ایک راجپوت خاندان میں پیدا ہوا۔ والد صاحب راؤ انور علی خان محکمہ مالیات میں ملازم ہونے کے ساتھ ساتھ علاقے کے ایک بااثر زمیندار بھی تھے۔ ان کی شخصیت میں عام زمینداروں کے برعکس توازن اور اعتدال بہت تھا۔ والدہ بھارت کے صوبہ اتر پردیش سے ہجرت کر کے آئی تھیں۔ والدہ صاحبہ نے شروع ہی سے خوش اخلاقی اور خدا خوفی کا درس دیا۔ والد صاحب جہاں دیدہ اور سنجیدہ مزاج بزرگ تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اولاد کی جسمانی تربیت کے ساتھ ساتھ ذہنی اور روحانی غذا کا بھی انتظام ہونا چاہئے۔ وہ اکثر گھر میں کہا کرتے تھے "اچھا کھاؤ لیکن سادہ پہنو"۔ میرے والد میری آئیڈیل شخصیت تھے۔ اگرچہ بچپن ہی سے خوش مزاج اور ماحول کو خوش گوار بنا کر رکھنے والا انسان ہوں لیکن والد کے سامنے ہمیشہ سنجیدہ رہتا تھا۔ بچپن عارف والا کی گلیوں میں گزرا۔ آج بھی بچپن کی یادیں صفحہ ذہن پر نقش ہیں۔ عارف والا شہر اپنی ریتلی زمین اور خربوزے کے کھیتوں کے باعث پنجاب بھر میں مشہور ہے۔ اسی ماحول میں بچپن اور لڑکپن گزارا۔ والد صاحب صبح کی نماز کے بعد جب سیر پر جاتے تو مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔ ان کی انگلی پکڑ کر ہرے بھرے کھیتوں میں نکلتا۔ فطرت کے اس رومان پرور ماحول نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ فطرت پسندی اور ماحول کی شگفتگی نے میرے شاعرانہ مزاج کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اپنے سکول کے زمانے کے دو استادوں سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ ایک قاضی عبدالرحمن تھے جنہیں فارسی اور اردو پر خاصا عبور تھا۔ ان کی طبیعت رعب دبدبے والی تھی اور انہیں دیکھ کر ریاض خیر آبادی کا شعر یاد

بقیہ اندرونی صفحات

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 18 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد نمبر 18 نومبر 2016 شمارہ نمبر 11

مدیر اعلیٰ ⊙ عامر بن علی

مدیر ⊙ حسن عباسی

{مجلس ادارت}

ڈاکٹر صغرا صدف ⊙ ابرار ندیم ⊙ ڈاکٹر جعفر حسن مبارک
⊙ سید اسد رضوی ⊙ سعدیہ شیخ (برطانیہ)

{مجلس مشاورت}

محمود ظفر اقبال ہاشمی (سعودی عرب) ⊙ ظفر خان (آسٹریلیا) ⊙ ارشد نذیر ساحل (چین)
محمد ادریس لاہوری (امریکہ) ⊙ ناز اوکاڑوی ⊙

کمپوزنگ ⊙ نستعلیق کمپوزنگ : 0321-4736769 ڈیزائنر ⊙ نعمان حسن: 0333-4916383

ٹائٹل و گرافکس ⊙ محمد احسن گل : 0300-4529821

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ
F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
حسن عباسی: 0300-4489310 ناز اوکاڑوی: 0301-4492133
nastalique786@gmail.com

قیمت فی شمارہ 100 زر سالانہ بذریعہ ای پیسہ بھیجنے کے لیے
Hassan Mahmood - ID.No 31204-7298386-9 - Cell: 0300-4489310

سالانہ ممبر شپ

بذریعہ ڈاک (پاکستان) 1000 روپے ⊙ ڈاک خرچ بیرون ملک 5000 روپے
رابطہ : 0331-4489310 - 0300-4489310

فہرست

حمد، نعت، سلام ۳

مضامین:

○ شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں / ڈاکٹر وحید احمد ۵
○ ن م راشد / ساحل سلہری ۶
○ محبتوں کا شہریار / اکرم باجوہ ۱۱
○ عارف منصور (ملتانی) / زاہد محمود شمس ۱۲
○ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں / خورشید بیگ میلسوی ۱۳
شاعری (غزل) ۱۳
○ چار دن وادیٔ کشمیر میں / ایم آر شاہد ۱۹
○ کچھ نسل انا عید صافی اور اس کی شاعری کے بارے میں / سمندر منصوری ۲۳
○ سفر نامہ مکتن / سعدیہ بتول ۲۵

افسانے:

○ جنسی باز / موپساں / ترجمہ: سمندر منصوری ۳۰
○ آنکھوں کے راز اور خول / سیمین علی ۳۳
○ وہ کون تھی / او ہنری / ترجمہ: احمد عدنان طارق ۳۶

شعری گوشے: پروفیسر ارجمند قریشی، محمود غزنی، خلیل فاروقی، سید اقبال سعدی، طارق چغتائی، اقرار مصطفیٰ، جمیل عباس، خالق آرزو،
۳۹ تا ۳۶

○ بقیہ انٹرویو/ کیپٹن (ر) عطا محمد خان / ناصر معروف ۴۷-۴۸
مختصر ادبی خبریں ۴۹
تبصرۂ کتب ۵۲
نامہ ہائے احباب ۵۵

Far East Marketing Co.
Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

حمد، نعت، سلام

حمد

ربِ ارض وسما!
میں ہوں بندہ ترا
تیری حمد وثنا ہے مرا آسرا
خاک بے جان سے
رزق میرے لئے
تو نے پیدا کیا، تو ہے میرا خدا
حرف جو تھا نہاں
بہر کون ومکاں
مجھ کو سکھلا دیا، علم تیری عطا
یہ ہدایت تری
چار سو روشنی
تیر اور دا، مجھ کو تو مل گیا
ابتدا بھی ہے تو
انتہا بھی ہے تو
انتہا بھی ہے تو
تو رہے گا سدا، صرف تجھ کو بقا

ڈاکٹر ایوب ندیم/لاہور

حمد باری تعالیٰ

رنگ کو پھول کے اتارا پاس
چاند کے رکھ دیا ستارا پاس
تو ہی بھیجے تجی بلائے گا
اے خدا! سب کو ہی دوبارہ پاس
پورا رکھتے ہیں تول جو ان کے
آنکھیں پائے گا خسارا پاس
ناخدا مان لو خدا کو اگر
خود ہی آئے گا پھر کنارا پاس
گو کہ ہم ہیں بہت ہی نافرمان
پھر بھی رکھتا ہے وہ ہمارا پاس
میں ڈروں کس لئے جہنم سے
تیری رحمت کا ہے سہارا پاس
گنبد خضرا اور کعبہ کا
میری آنکھوں کے ہے نظارہ پاس
اے خدا ہے یہی دعائے سعید
نم آئے نہ اب شرارا پاس

سعید محمد سعید/لاہور

نعت رسولؐ

مشتاق دید کو ترے درشن کی آرزو
لے آئی پاس روضہ اقدس کے روبرو
باطل میں اور حق میں کریں کیسے امتیاز
لازم ہے جانشین محمدؐ کی جستجو
جبریلؑ بام سدرہ سے آگے نہ جاسکے
عرش بریں پہ آپؐ نے کی حق سے گفتگو
مدح نبیؐ اک ایسا عمل ہے پئے نجات
کرتے ہیں جس کی اہل قلم دل سے آرزو
تو نغمہ حیات ہے تو وجہ کائنات
تجھ سے ہی لامکاں سے جڑے ہیں یہ چارسو
معراج سے حضورؐ جو آئے ہیں لوٹ کر
اب کیجئے مشاہدۂ حق کی گفتگو
منصورؔ گر نصیب مرا یاوری کرے
مداحِ رسولؐ میں ہو جاؤں سرخرو

مظفر حسن منصور/لاہور

نعت

مجھ کو عاشق نبیؐ کا بنائے طلب
مجھ کو اس راہ پر لے کے آئے طلب
مجھ کو حاصل حضوری کا اعزاز ہو
ہے یہ خواہش مری بر بنائے طلب
جلد خاک مدینہ کو میں چوم لوں
مجھ کو مولا نہ اب آزمائے طلب
میرے دل کو بھی تسکین کر دے عطا
میرے ہونٹوں پہ بھی مسکرائے طلب
دل میں میں نے بسایا ہے سرکار کو
کیوں کسی اور کی اب سمائے طلب
زائران حرم کے لیے ہے دعا
تا بہ منزل انہیں لے کے جائے طلب
اے ندیم اب تو حمد وثنا سے ہے کام
ہے طلب کب مری بر بنائے طلب

ریاض ندیم نیازی/سبی

نعت شریف

آپؐ کی ہر اک بات میں خوشبو
یعنی آپؐ کی ذات میں خوشبو
جب بھی جاتے آپؐ کہیں پر
چلتی آپؐ کے سات میں خوشبو
خوشبو کا یہ عالم دیکھا
دیکھی آپؐ کی گھات میں خوشبو
جب سے آپؐ جہاں میں آئے
لائے اپنے سات میں خوشبو
دنیا والوں کو ہے بخشی
آقاؐ نے خیرات میں خوشبو

آپؑ سے پہلے باغ غنچے
گلشن کے ہر پات میں خوشبو
آپؑ کے دم سے دیکھی سب نے
کیفی دن اور رات میں خوشبو

چودھری کرم علی کیفی/پاک پتن

سلام

کر بلا راہ دیکھتی ہوگی
جس کی منزل بھی ساتھی ہوگی
دشت میں جو دیئے لہو سے جلے
حشر تک ان کی روشنی ہوگی
جانے عباسؑ کیوں نہیں لوٹے
کتنی خیموں میں بے کلی ہوگی
نوک نیزہ پہ جو ہوئی، تم نے
وہ تلاوت کہاں سنی ہوگی
ابن حیدرؑ تمہارے رتبے پہ
تیری قسمت بھی جھومتی ہوگی
کس قیامت کا وہ سماں ہوگا
شام عاشور جب ڈھلی ہوگی
جو شہادت کو اوڑھتی ہے جلیل
زندگانی وہ، سرمدی ہوگی

احمد جلیل/اوکاڑہ

بحضورعالی مقام

رہتا ہے سارا سال مجھے غم حسینؑ کا
ٹھہرا ہوا ہے مجھ میں تو موسم حسینؑ کا
اس کو جھکا نہیں سکا کوئی یزید وقت
اونچا گلی گلی میں ہے پرچم حسینؑ کا
آؤ کہ اور تیز کریں نوحے کی صدا
حق تو ادا ہوا ہے بہت کم حسینؑ کا
جاں دے کے اس نے دین محمدؐ بچا لیا
احساس اتار سکتے نہیں ہم حسینؑ کا
ہو دل سے جیسے آنکھ تلک کربلا بچھی
ہر اشک کرتا جاتا ہے ماتم حسینؑ کا
اس کے لہو نے کر دیا تنہا یزید کو
بھرتے ہیں آج نازؔ بھی دم حسینؑ کا

نازاوکاڑوی/لاہور

بحضورعالی مقام

جس کی سمجھ میں آ گیا خطبہ حسینؑ کا
وہ چھوڑتا نہیں کبھی رستہ حسینؑ کا
اسلام سر بہ سر نظر آتا تھا سامنے
نانے سے اتنا ملتا تھا چہرہ حسینؑ کا
جلتا چراغ ہاتھ سے اپنے بجھا دیا
اپنی مثال آپ ہے جذبہ حسینؑ کا
آنکھوں سے میرے اشک نہیں رکتے ایک پل
بچوں کو جب سناؤں میں قصہ حسینؑ کا
رکھے گا شرمسار یزیدوں کو حشر تک
قرآن نوک نیزہ پہ پڑھنا حسینؑ کا
اے نازؔ! ہم نماز نہ چھوڑیں کسی طرح
پیغام دیتا رہتا ہے سجدہ حسینؑ کا
بھرتے ہیں آج نازؔ بھی دم حسینؑ کا

نازاوکاڑوی/لاہور

سلام بحضورامام حسینؑ

اے حسین ابن علیؑ! تیری امانت کو سلام
صیغم کرب و بلا! تیری شجاعت کو سلام
مصلحت کوئی نہ تیری راہ میں حائل ہوئی
پیکر عزم و وفا! تیری صداقت کو سلام!
قاسم و اکبر نے تیرا ہر سبق از بر کیا
جو پیا دونوں نے اس جام شہادت کو سلام
کیا خبر تھی در سکینہ کے اتارے جائیں گے
دختر والا صفت کے عزم و ہمت کو سلام!
بیبیوں کی عزت و حرمت تمہارے دم سے تھی
بے ردا جو ہو گئیں ان کی طہارت کو سلام!
موت اصغر کی جو لکھی وقت کی تاریخ نے
اے محمدؐ کے نواسے! اس عبادت کو سلام!
مر کے روشن کر دیا نانے کی امت کا چراغ
ظلمتوں میں جگمگاتی اس روایت کو سلام!
یاد ہیں تیری وفائیں جب تلک زندہ ہیں ہم
حضرت عباسؑ تیری ہر حمایت کو سلام!
آرزو ہے جاں کنی کے وقت، ہو ورد زباں
مصطفیٰؐ کے لاڈلے کی استقامت کو سلام!

خالق آرزو/لاہور

سلام

ظلمت کا پہلے پہر بٹھایا حسینؓ پہ
پھر ظالموں نے تیر چلایا حسینؓ پہ
معصوم لوگ تھے وہ جنہیں کر دیا شہید
آئے نہ چین حشر تلک تجھ کو اے یزید
نانا کا اپنے دین بچا کر گئے حسینؓ
حق کو بلندیوں پہ سجا کر گئے حسینؓ
ابن علیؑ کا نام رہے گا جہان میں
اب ایسا پھول ملتا نہیں گلستان میں
اللہ کی راہ پر ہی رہے گامزن حسینؓ
آباد کر گئے ہیں وفا کا چمن حسینؓ
یوں کر گئے رقم وہ شجاعت کی داستاں
منسوب ہے حسینؓ سے ہمت کی داستاں
لائے تو کوئی سامنے آخر حسینؓ سا
جو نام اونچا کر گئے نانا کے دین کا
ایسا پیام دے کے گئے ہیں مرے حسینؓ
ٹھنڈک ہے میری آنکھوں کی ہیں میرے دل کا چین

محمد اقبال پیام/لاہور

علم بلند ہے سدا حسینؑ تیرے نام کا
زمانہ معترف ترا ہے اور تیرے کام کا
خدا ہی جانتا ہے یا رسولؐ جانتے ہیں بس
کسی کو بھی پتہ نہیں حسینؑ کے مقام کا
اندھیرا چھانے لگتا ہے مری نظر میں دن کو بھی
کبھی جو یاد آتا ہے سفر مجھے وہ شام کا
شہید بچے کر کے بیبیوں کو ننگے سر کیا
بھلا طریقہ کون سا ہے آخر انتقام کا
حسینؑ جنگ تو نہیں امن چاہتے تھے پر
جواز کوئی بھی نہیں تھا اس تو قتل عام کا
ادب سے نام لیجئے بیبیوں کا موسّو
ادب کا ہے مقام یہ مقام ہے احترام کا
سلام اس پہ بھیجتے ہیں آسمان کے مکیں
کہ جو بھی شعر پڑھتا ہے حسینؑ پر سلام کا
مجھے ہے فخر مجھ کو اور ناصر اس پہ ناز ہے
کہ میں تو اک غلام ہوں حسینؑ کے غلام کا

ناصر معروف/مسقط

سلام بحضور امام عالی مقامؑ

تمہارا ایک سیہ کار سے تعلق ہے
ہمارا نور کے مینار سے تعلق ہے
تمہارا ربط ہے ظلمت کی ہر علامت سے
ہمارا صبح کے آثار سے تعلق ہے
ہمارے عشق کا محور فقط بہتر ہیں
تمہارا لشکر جرار سے تعلق ہے
تمہارا گھر ہے تعفن زدہ جہنم میں
ہمارا خلد کی مہکار سے تعلق ہے
تمہارا پیشوا اشقی یزید ہے لیکن
ہمارا صاحب کردار سے تعلق ہے
ہمارے شاہؑ کی پہلی غذا لعاب نبیؐ
تمہارا شام کے مے خوار سے تعلق ہے
ہمارے شاہؑ کے آگے ہے کائنات نگوں
تمہارا فاسق و بدکار سے تعلق ہے
ہمارے شاہؑ تو پیکر ہیں زہد و تقویٰ کا
تمہارا ایک گنہگار سے تعلق ہے
ہم اہل بیت کے قدموں کی خاک ہیں واصف
ہمارا اس لئے دستار سے تعلق ہے

(۲)

حسینؑ آپ کے انکار سے تعلق ہے
سو ہر یزید کے انکار سے تعلق ہے
ہمارے گھر پہ جو لہرا رہا ہے حق کا علم
ہمارا ایک علمدار سے تعلق ہے
ہم اس لئے تو شفا بانٹتے ہیں لوگوں میں
ہمارا عابدؑ بیمار سے تعلق ہے
ہم اپنے سر میں نہ کیوں خاک کربلا ڈالیں
ہمارا شہر عزادار سے تعلق ہے
یزید وقت لرزتا ہے اس لئے ہم سے
ہمارا حیدر کرار سے تعلق ہے
ہماری قبر کے کتبے پہ "یا حسینؑ" لکھو
کہ ان کا حشر کے دربار سے تعلق ہے
علیؑ کا نعرہ لگا کر بہشت میں جاؤ
علیؑ کے نعروں کا اس پار سے تعلق ہے
ہم اس لئے تو مناتے ہیں جشن غم واصف
ہمارے غم کا بھی غم خوار سے تعلق ہے

جبار واصف/لاہور

سلام اہل بیتؑ کے حضور

پڑھتا ہے ذرہ ذرہ قصیدہ حسینؑ کا
دونوں جہاں میں چلتا ہے سکہ حسینؑ کا
خاک شفا نہ ہوتی کبھی خاک کربلا
شامل جو اس میں خون نہ ہوتا حسینؑ کا
نہلایا ظالموں نے اسے اس کے خون میں
تصویر مصطفےٰ تھا جو بچہ حسینؑ کا
جنت رسولؐ پاک نے بخشی حسینؑ کو
کعبہ خدا نے کر دیا ورثہ حسین کا
اپنی مثال آپ تلاوت حسینؑ کی
اپنی مثال آپ ہے سجدہ حسین کا
تخلیق کائنات کا مقصد سمجھ گیا
جس کی سمجھ میں آیا ہے جذبہ حسینؑ کا
گزرے گا پل صراط سے خوش ہوا سلیم
ہاتھوں میں تھام کر جھنڈا حسینؑ کا

عمران سلیم/لاہور

سجدہ حسینؑ کا

تشنہ رہا تھا گو وہاں کنبہ حسینؑ کا
سیراب دیں کو کر گیا سجدہ حسینؑ کا
کیسے مثال لاؤ گے صبر حسینؑ کی
دنیا میں عکس کون ہے دو جا حسینؑ کا
لعنت یزید و شمر کا ٹھہری نصیب اور
ہر دل میں بن گیا ہے ٹھکانہ حسینؑ کا
اس پر عذاب ٹوٹیں گے دونوں جہان میں
روکا تھا جس لعین نے رستہ حسینؑ کا
اس کو نہیں ملے گی شفاعت حضورؐ کی
کرتا نہیں دکھی جسے صدمہ حسینؑ کا
جنت مرے نصیب میں ہو کے نہ ہو مگر
میرے لئے ہے کافی حوالہ حسینؑ کا
کوثر پیئے گا حشر میں دست حضورؐ سے
اپنایا جس کسی نے بھی رستہ حسینؑ کا
نیزے پہ دے رہی تھی گواہی یہ آیتیں
سردار انبیاء کا ہے نانا حسینؑ کا
شافی غلام آل محمدؐ ہے دوستو
آنکھوں پہ ہر یہ کہتا ہے صدقہ حسینؑ کا

عقیل شافی/لاہور

مضمون

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں

ڈاکٹر وحید احمد

Time & space کی زمانی و مکانی بحث فلسفے کی بنیاد ہے۔ یہ وہ پہیلی ہے جس کی گرہ بہت مضبوط ہے۔ جب سکندر اعظم مصر کے راستے فریجیا کے قصبے میں پہنچا تو اسے ایک گرہ دکھائی گئی جو بہت گنجلک تھی۔ مشہور تھا کہ جو یہ گرہ کھولے گا حکومت کرے گا۔ سکندر نے وہ گرہ تلوار کے وار سے کھولی۔ زمان و مکان کی گرہ پر ابھی تک کسی تلوار نے وار نہیں کیا۔

طبیعات اور مابعد الطبیعیات ایک اور فریجیائی گرہ ہے۔ جب طبیعات کی حدود لامحدود سے ملتی ہیں تو انسانی ذہن کو اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے اور خوف کا بھی۔ اقبال نے کہا:

یہ گنبد مینائی یہ عالم تنہائی
مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی

Time Travel ایک افسانوی خواہش ہے جسے پوری کرنے کے لیے آج بھی انسان کا تحت الشعور تیار بیٹھا ہے Time Machine کا تصور بھی اسی سوچ کا شاخسانہ ہے۔

The interpretation of Dreams سگمنڈ فرائیڈ کا شاہکار ہے۔ وہ لاشعور اور تحت الشعور کے تال میل سے خوابوں کی شعوری تشریح کرتا ہے۔ مگر یہ نظریہ اتنا نازک اور پیچیدہ ہے کہ فرائیڈ نے کم از کم آٹھ مرتبہ اس کتاب میں ترامیم کیں اور ایک دقیق نظر ثانی کے بعد اشاعت کی۔ وہ برویئر، ژونگ اور ایڈلر کے برعکس حیاتیاتی خواہشات کو خوابوں کی وجہ بتاتا ہے۔ وہ خوابوں کو خواہشات کی تکمیل کا نام دیتا ہے اور انہیں لاشعور کی شاہراہ قرار دیتا ہے۔

شاعری میں یہ سہولت ہے کہ وہ طبیعیات، مابعد الطبیعیات، زمان و مکاں اور خوابوں کو وجدان کے چاک پر رکھ کر کوزہ گری کرتی ہے۔

غالب نے کہا:

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

اختر رضا سلیمی کا ناول "جاگے ہیں خواب میں" ان تمام تصورات کا ملغوبہ ہے۔ ناول ان لفظوں سے آغاز کرتا ہے "یہ سب خواب سا ہے۔ بالکل خواب سا۔" اور ہزاروں نوری سال کی دوری سے آتی روشنی کی لہروں پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ زمان کے خواب نے کالا کمبل اوڑھ رکھا ہے۔ چبوترے کے قریب چیڑ کا درخت وقت اوڑھے کھڑا ہے۔ تنگ و تاریک غار کا دوسرا دہانہ پریوں کے دیس میں کھلتا ہے۔ ماہ تمام دو چٹانوں کو اجاگر کرتا ہے۔ ماہ کامل میں ماہ نور کی محبت چمک رہی ہے۔ کمبل پوش قوانین فطرت میں جکڑا ہوا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اگر میں روشنی کی رفتار کے زیر اثر 65 سال پہلے کا منظر دیکھ سکتا ہوں تو 5 سال بعد کا کیوں نہیں۔ اس کی سوچ کا بلیک ہول گمان کرتا ہے کہ اسٹیفن ہاکنگ مابعد الطبیعیات کا بندہ ہے۔ اس کے وجدان کی اضافت بتاتی ہے کہ آئن سٹائن بھی مابعد الطبیعیاتی ہے۔ کیونکہ طبیعیات بھی ایک سطح پر جا کر مابعد الطبیعیات سے مل جاتی ہے۔ نور خان، عبداللہ، امر سنگھ، سید احمد بریلوی، مہاراجہ رنجیت سنگھ، علی احمد، ظفر علی خان، نوید اور عزیز خان وقت کے کس مدار میں گھوم رہے ہیں؟ صابرہ خانم، عابدہ خانم، ماہ نور اور ماریہ بقول غالب بنات النعش گردوں ہیں۔ کبھی دن کے پردے میں نہاں، کبھی رات کی تاریکی میں عریاں۔

ناول میں ایک اہم موڑ زمان کا Cerebral Edema ہے جس سے پیدا ہونے والی Hallucinations ذہن کے کون و مکانی عمل میں ہلچل پیدا کرتی ہیں۔ ایک مابعد الطبیعیاتی تبدیلی اسے Time Machine میں بٹھاتی ہے۔ لاشعور، تحت الشعور اور شعور کے درمیان حائل پردے اٹھ جاتے ہیں۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ چٹان پر کندہ مہاراجہ اشوک کے فرمان پڑھ لے جو خروشتی رسم الخط میں تحریر ہیں۔

ناول کی خوبصورتی یہ ہے کہ روایت سے ہٹ کر لکھا گیا ہے۔ طبیعیات اور مابعد الطبیعیات کی سلوں کو شاعرانہ پلستر سے جوڑ کر کہانی کی عمارت اٹھائی گئی ہے۔ جس کے دریچوں میں گزرا ہوا وقت پردے ہلاتا ہے اور جس کے شیشوں سے نگار آئندہ کا ہیولا نظر آتا ہے۔

ن م راشد

ساحل سلہری

اُردو ادب میں جدید اُردو نظم کا بانی مولانا الطاف حسین حالی کو تصور کیا جاتا ہے لیکن انھوں نے بھی نظم میں کسی نئی ہیئت کو فروغ نہیں دیا۔ حالی نے روایت شکنی تو کی یعنی اُردو غزل کے عین عروج کے عہد میں نظم گوئی کی روایت قائم کی۔ اس روایت میں محمد حسین آزاد بھی اُن کے ساتھ برابر کے شریک تھے۔ انھوں نے اُس وقت نظم کی ضرورت کو محسوس کیا کہ نظم غزل کے برعکس زیادہ مفید صنف ثابت ہو سکتی ہے۔ نظم میں موضوع اور خیال کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ نظم میں سماجی مسائل کی عکاسی غزل کی نسبت بہتر کی جا سکتی ہے۔ اس طرح حالی اور آزاد نے غزل کی کلاسیکی روایت کو توڑ کر جدید شاعری کی بنیاد تو رکھ دی لیکن معرا اور آزاد نظم کا تصور نہ دے سکے۔ اُن کے عہد میں قافیہ اور ردیف کی پابندی لازمی تھی۔ انھوں نے غزل کے رنگ میں نظم نگاری کی، اُن کی نظمیں غزل کی جدید صورتیں ہیں۔ حالی اور آزاد نے غزل سے روگردانی تو ضرور کی لیکن نظم میں بھی کوئی واضح ہیئت قائم نہ کر سکے۔

حالی اور آزاد کے بعد اُردو شاعری میں جدید نظم کا ایک اور دور شروع ہوا۔ اس عہد کے شعرا میں اسماعیل میرٹھی اور شرر نمایاں ہیں۔ انھوں نے حالی اور آزاد کی پابند نظم کی روایت کو نظمِ معرا میں تبدیل کر دیا۔ اسماعیل اور شرر کی اس نئی ہیئت اور نئے تجربے کو اس عہد کے شعرا اور ناقدین نے ماننے سے انکار کر دیا اور اسے نثرِ مرجز کا نام دیا گیا۔ چوں کہ اس عہد میں پابند نظم کا رواج تھا اور قافیہ ترک کرنا قابلِ قبول نہ تھا۔ اسماعیل اور شرر نے بھی کوئی بڑی تبدیلی نہ کی صرف نظم میں کہیں کہیں مصرعوں میں قافیہ ترک کر دیا اور بحر کے ارکان کی تعداد کو نہ توڑا۔ اُن کی یہ نئی ہیئت (نظمِ معرا) آزاد نظم کی پیش رو ضرور ثابت ہوئی۔

ن۔م۔راشد نے حالی اور آزاد کی پابند نظم اور اسماعیل اور شرر کی نظمِ معرا کی روایت کو یکسر توڑا اور اردو شاعری میں آزاد نظم کی نئی ہیئت کی بنیاد رکھ دی۔ انھوں نے نہ صرف قافیے اور ردیف کی روایت کو توڑا بلکہ بحر کے ارکان کی تعداد کو بھی توڑ ڈالا۔ اس نئی ہیئت میں شاعر نظم کے ہر مصرعے میں اپنی مرضی سے ارکان کی تعداد مقرر کر سکتا ہے۔ انھوں نے آزاد نظم کے مصرعے کو ایک رکن تک محدود کر دیا۔ ن۔م۔راشد کی روایت شکنی اور نئی ہیئت کے بارے میں ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری رقم طراز ہیں:

"راشد کا بہت بڑا کارنامہ اُردو میں آزاد نظم (Free Verse) کا فروغ ہے۔ عصرِ حاضر میں اُردو نظم کے لیے سب سے زیادہ پسندیدہ وسیلۂ اظہار اسی ہیئت کو سمجھا جاتا ہے اور اس میں بنیادی طور پر مستقل مزاجی سے کی گئیں راشد کی کوششوں کو دخل ہے۔ یوں انھوں نے غزل گوئی بھی کی اور آزاد نظم کے لیے روایتی پابند ہیئتوں اور سانیٹ وغیرہ کو بھی وسیلۂ اظہار بنایا مگر ان کے جوہر پوری طرح سے آزاد نظم ہی میں کھلے۔"(۱)

اُردو شاعری میں آزاد نظم کی نئی ہیئت ایک انقلابی تبدیلی تھی۔ اس تبدیلی کو نثرِ مرجز کہا گیا کیوں کہ اس عہد میں بحر توڑنے کا رواج نہیں تھا اور راشد نے بحر کے ارکان اپنی مرضی سے ہر مصرعے میں الگ الگ رکھ کر ایک بہت بڑا تجربہ کیا جسے عام شاعر تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ناقدین اور شعرا نے اس حقیقت کو قبول کر لیا کہ ن۔م۔راشد نے اُردو شاعری کو ایک خوب صورت نئی ہیئت، نیا رنگ و آہنگ اور ایک نیا وسیلۂ اظہار عطا کیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری مزید لکھتے ہیں:

"یہ حقیقت ہے کہ راشد نے اُردو شاعری کو جو نیا رنگ و آہنگ دیا اور اسے طرزِ احساس سے لے کر طرزِ اظہار تک جن انقلابی تبدیلیوں سے ہم کنار کیا۔ ان کے توسط سے اسے بالکل نئی ڈگر پر گامزن ہونے کا موقع ملا یہ راز وہی ہیں جنھوں نے اُردو شاعری کے جمود کو توڑ کر اس کے ٹھہراؤ کو بہاؤ میں بدل دیا۔ انھوں نے روایت کے مضمحل اور بے جان پہلوؤں سے انحراف کرتے ہوئے زندہ اور توانا عناصر کے استعمال میں تازہ کاری کی ہے۔"(۲)

روایت کی تقلید دراصل کسی بھی معاشرے میں جمود کا سبب بنتی ہے۔ اس سے معاشرتی قدروں میں ٹھہراؤ سا آ جاتا ہے اسی طرح ادب میں جب تک موضوعی آزادی اور ہیئتی آزادی نہ ہو جمود برقرار رہتا ہے۔ شاعری میں ہیئتی تبدیلی سے اس کی زبان

اور اسلوب میں بھی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ راشد کی تبدیلی کا محرک اول ان کا پہلا شعری مجموعہ "ماورا" تھا۔ اس شعری تصنیف کی تخلیق کے بعد جدید اردو نظم ایک نئی ہیئت اور نئی ڈگر پر گامزن ہو گئی۔ ڈاکٹر حنیف کیفی اپنی تصنیف "اردو نظم معرا اور آزاد نظم" میں ن۔م۔راشد کے بارے میں لکھتے ہیں:

"آزاد نظم کو راشد کے ہاتھوں جو مقبولیت نصیب ہوئی یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ اردو میں اس کے بانی مبانی تصور کیے جانے لگے۔ یہی نہیں بلکہ اتنی تیز رفتاری کے ساتھ آزاد نظم کا نام راشد کے ساتھ وابستہ ہو گیا کہ ایک دوسرے کے بغیر دونوں کا تصور ناممکن ہو گیا۔"(۳)

راشد شاعری میں انفرادی تجربے کے حامی تھے۔ وہ انسان کی شخصی و انفرادی آزادی کے قائل تھے۔ وہ شاعر کے انفرادی شعری تجربے کی آزادی کو ضروری خیال کرتے تھے۔ راشد کی موضوعاتی اور ہیئتی آزادی کے بارے میں ڈاکٹر ضیاء الحسن رقم طراز ہیں:

"موضوعاتی آزادی کو ساتھ راشد ہیئتی آزادی کے بھی داعی ہیں راشد ان روایتی سانچوں کے اسیر ذہنوں سے زیادہ نالاں تھے جو ہیئتوں کی مخالفت محض اس بنا پر کر رہے تھے کہ ہر نئی چیز ایسے روایتی ذہنوں کے لیے قابل قبول نہیں ہوتی وہ فکری اور ہیئتی دونوں حوالوں سے قدامت کے اسیر ہوتے ہیں۔"(۴)

ن۔م۔راشد آزاد نظم کے بانی ہیں اگرچہ کچھ ناقدین تصدق حسین خالد کو اس نئی ہیئت کا پہلا شاعر سمجھتے ہیں لیکن اس بات کا واضح ثبوت ابھی تک نہیں مل سکا۔ ۱۹۳۲ء میں ن۔م۔راشد کی نظم آزاد ہیئت میں سب سے پہلے شائع ہوئی جو اس بات کی دلیل ہے کہ راشد ہی آزاد ہیئت کے پہلے شاعر ہیں۔ ڈاکٹر حنیف کیفی کے بہ قول اگر تصدق حسین خالد کو پہلا شاعر مان لیا جائے تب بھی راشد آزاد نظم کی بنیاد رکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے اس ہیئت کے فروغ اور رائج کرنے میں جتنی محنت کی ہے اتنی کسی دوسرے شاعر نے نہیں کی۔ ن۔م۔راشد نے اگرچہ آزاد ہیئت میں نظم نگاری کی ہے لیکن ان کی شاعری میں بحر اور قافیے غالب نظر آتے ہیں۔ وہ نظم کے کئی مصرعوں میں قافیے لا کر اس میں نغمگی اور حسن پیدا کر دیتے ہیں۔ راشد نے کوئی نیا عروضی نظام تو متعارف نہ کروایا صرف نظم کی رائج ہیئت کو ہی بگاڑا ہے، کیوں کہ وہ رائج بحور سے مطمئن تھے۔ تصدق حسین خالد، ایم ڈی تاثیر اور حسن لطیفی آزاد نظم کے پیش رو تو ہیں مگر انھیں کسی طور بھی رجحان ساز قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ آزاد نظم کے پہلے بڑے شاعر راشد ہی ہیں۔ ان کی چند منتخب نظموں کے اقتباسات یوں ہیں:

نئے آدمی کا نزول
اور اس پر غضب کا سرور
نئے آدمی کی اس آمد سے پہلے
مہینوں کے بھوکے کئی بھیڑیوں کی فغاں
(زمانے کی بارش میں بھیگے ہوئے بھیڑیے)
نئے لفظ و معنی کی بڑھتی ہوئی یک دلی
اور اس پر پرانے نئے بھیڑیوں کی فغاں
فغاں کا غضب اور غضب کا سرور
(نیا آدمی، گماں کا ممکن)

ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجیے:

کر چکا ہوں آج عزم آخری......
شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوک زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک وہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند
رات کو جب گھر کا رخ کرتا تھا میں
تیرگی کو دیکھتا تھا سرنگوں
منہ بسورے، رہ گزاروں سے لپٹے، سوگورا
گھر تھا میں انسانوں سے اکتایا ہوا
میرا عزم آخری یہ ہے کہ میں
کود جاؤں ساتویں منزل سے آج
(خودکشی، ماورا)

علاوہ ازیں ن۔م۔راشد کی نظموں میں "حسن کوزہ گر" اور "اندھا کباڑی" کافی مقبول ہیں۔ راشد کا عہد تغیرات کا عہد تھا۔ مغرب کی سیاسی، معاشی اور فکری تحریکوں نے بیسویں صدی میں برصغیر کے ادب کو متاثر کیا۔ راشد نے سیاست، معیشت اور فکر کے شعری رویے مغرب سے لیے کیوں کہ انھوں نے اپنی عمر کا ایک عرصہ دیار غیر میں بسر کیا۔ ان کی نظمیں موضوعی اور ہیئتی اعتبار سے متنوع پہلو کی حامل ہیں۔ راشد کی نظم "سباویراں" سے ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجیے:

سباویراں کہ اب تک اس زمیں پر ہیں
کسی عیار کے غارت گروں کے نقش پا باقی
سبا باقی، نہ مہ رُوئے سبا، باقی
سلیماں سر بزانو
اب کہاں سے قاصدِ فرخندہ پے آئے
(سباویراں، ایران میں اجنبی)

ن۔ م۔ راشد کی نظموں پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر آفتاب احمد لکھتے ہیں:

"نظم "سباویراں" کا آہنگ ایک عظیم نوحے کا آہنگ ہے۔ اس کا دُور، اس کی روک تھام، اس کا سوز و ساز، اس کی مایوس پکار، اس کی علامت کی گہری معنویت کسی ایک جدید نظم میں مشکل ہی سے یہ سب باتیں جمع ہوئی ہوں گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ "سباویراں" اس دور کی عظیم ترین نظموں میں سے ہے۔"(۵)

ن۔ م۔ راشد ایران شناسی اور فارسی سے خاص شغف رکھتے تھے۔ اسی بنا پر اُن کی شاعری میں ایرانی تہذیب و معاشرت کے اثرات نظر آتے ہیں۔ بیسویں صدی میں اسماعیل میرٹھی اور شرر نے نظم معرا کی بنیاد رکھی اس کے بعد نئی ہیئت کی روایت پڑ گئی اور کچھ عرصہ بعد راشد نے آزاد نظم کی ہیئت تخلیق کی اس حوالے سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"اگر آزاد شاعری کو بھی شاعری کی فہرست میں رکھ لیا جائے تو پھر نثر کیا ہوتی ہے اور نظم کیا۔ تو آخر اتنی صدیوں تک ہم جو یہ سنتے آئے ہیں اور ادبا نے اپنی تصانیف میں بھی اس بات کی تشریح فرمائی کہ نثر کی یہ اقسام ہیں..... ان میں مرجز بھی ہے مقفیٰ بھی، مسجع بھی ہے اور نثر عاری بھی ہے۔ آخر میں یہ دیکھنا ہوگا کہ جس صنف کو انھوں نے نثر مرجز کہا یعنی جس میں وزن تو ہو مگر قافیہ نہ ہو تو پھر سوچنا ہوگا کہ آپ یہ نظم عاری یا یہ آزاد نظم جسے آپ فری ورس کہتے ہیں کس صنف میں شامل کریں گے۔"(۶)

درج بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اُس وقت ادبی حلقے میں راشد کی آزاد نظم کی ہیئت کو غیر مستحسن قرار دے کر اس ہیئت کی مخالفت کی گئی، کیوں کہ راشد نے نظم کی تعریف ہی بدل دی تھی اور ابھی تک راشد کی تخلیق کی گئی اس تعریف کا تعین نہیں ہوا تھا۔ راشد شاعری میں نئی ہیئتوں کو رواج دینے کے حق میں تھے۔ اس لیے انھوں نے ادبی حلقے کی بھرپور مخالفت کے باوجود آزاد نظم کی ہیئت کو فروغ دیا اور عمر کے آخری حصے تک اس میں نظمیں کہتے رہے۔

راشد نے اپنی شاعری میں نئی ہیئت پر خاص توجہ دی اور ایک رجحان کو فروغ دیا۔ ان کے موضوعات، زبان اور اسلوب میں ایک خاص تبدیلی دیکھنے میں ملتی ہے۔ موضوعات بدلنے اور ان میں وسعت پیدا کرنے سے شاعری کی ہیئت بھی متاثر ہوتی ہے۔ راشد آسان وسیلہ اظہار کے متلاشی تھے اس لیے انھوں نے آزاد نظم نگاری کا آغاز کر دیا۔ جسے اُس وقت "نثر" کہا گیا اور بعد میں اس آزاد شاعری کو ایک ہیئت اور صنف کا نام دے دیا۔ راشد نے اپنی عمر کے آخری حصے میں نثری نظمیں بھی کہی ہیں لیکن انھیں پہچان آزاد نظم کی بدولت نصیب ہوئی۔

شاعر کے اظہار کی راہ میں بحریں، بحروں کے ارکان اور قافیہ رکاوٹ بنتا ہے۔ راشد نے اظہار کی راہ میں حائل ہونے والی ان رکاوٹوں کو ختم کر دیا لیکن بحریں اور قافیے ترک نہ کیے۔ آزاد نظم میں پابند اور نظم معرا کی طرح مصرعے مساوی نہیں ہوتے۔ راشد نے ہیئت کا ایک انوکھا تجربہ کیا جسے اس وقت تو تسلیم نہ کیا گیا مگر بعد میں آنے والے شعرا کے لیے آسانی کا باعث بنا۔ نظم کی اس ہیئت میں شاعر کو اپنے خیال کو لفظوں کا جامہ پہنانے میں دقت پیش نہیں آتی کیوں کہ راشد خود کہتے ہیں:

"میں فرد کی کامل آزادی اور اس کی انا کی نشو و نما کا شدت سے حامی ہوں۔ ایسی آزادی جس کے راستے میں کوئی روک ٹوک نہ ہو..... میرا عقیدہ یہ ہے کہ تمام اقدار کا مرکز انسان ہے اور تمام اقدار انسان کے ذاتی تجربات سے پیدا ہوئی ہیں"(۷)

آزاد نظم کے بانی شاعر ن۔ م۔ راشد اپنے شعری مجموعوں "لا=انسان" اور "گماں کا ممکن" کی نظموں کا ذکر کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں وہ ضرور فرد کی مکمل آزادی پر زور دیتے ہیں۔ اُن کی نظم "میرے بھی ہیں کچھ خواب" کے یہ مصرعے ملاحظہ کیجیے:

وہ خواب ہیں آزادیٔ کامل کے نئے خواب
ہر سعیٔ جگر دوز کے حاصل کے نئے خواب
آدم کی ولادت کے نئے جشن پہ لہراتے
جلاجل کے نئے خواب
اس خاک کی سطوت کی منازل کے نئے
خواب

(لا=انسان)

ن۔ م۔ راشد کامل شخصی آزادی کے پیشوا ہیں اس لیے وہ موضوعاتی آزادی اور نئی ہیئتی آزادی کا نظریہ بھی پیش کرتے ہیں۔ اپنے فلسفے کی بنیاد پر انھوں نے جدید اُردو نظم میں آزاد ہیئت کو فروغ دیا۔ اُن کی متعین کی ہوئی ان راہوں نے شعری اظہار کو آسان بنا دیا ہے۔ کیوں کہ آزاد ہیئت میں ہر کوئی آسانی کے ساتھ مصرعوں میں اپنے خیالات رقم کر سکتا ہے۔ اُسے خاص شعری ریاضتوں اور تجربے کی

ضرورت بھی پیش نہیں آتی۔ ن۔م۔راشد کی روایت شکنی اور ہیئتی تبدیلی نے شاعری کرنا آسان اور سہل بنایا دیا ہے۔ راشد کے اس تجربے کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا رقم طراز ہیں:

''بیسویں صدی میں اُردو نظم نگاروں نے ہیئت و مواد میں اتنے تجربات کیے ہیں کہ دوسری شعری اصناف پچھڑ گئی ہیں۔ ان ایک سو برسوں میں ممتاز شاعروں کی تعداد ایک درجن کے لگ بھگ ہے لیکن اب ایک بات پر اتفاق رائے ہو گیا کہ سب سے اہم نظم نگار علامہ اقبال ہیں۔ اس کے بعد پابند نظم کے افقی پھیلاؤ میں جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی کے تجربات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان تینوں شعرا نے آزادی سے پہلے بھرپور مقبولیت حاصل کر لی تھی اور اپنا بہترین کام بھی تخلیق کر لیا تھا۔ اسی دوران چوتھی دہائی کے وسط میں میراجی، راشد اور فیض کے اسما بھی رفتہ رفتہ متعارف ہونے شروع ہو گئے تھے''(۸)

اس دور میں میراجی ''ادبی دنیا'' کی وساطت سے متعارف ہوئے، فیض احمد فیض کا شعری مجموعہ ''نقشِ فریادی'' ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا اور ن۔م۔ راشد کا پہلا شعری مجموعہ ''ماورا'' اس سے پہلے شائع ہو چکا تھا۔ ناقدین کے مطابق تصدق حسین خالد کی آزاد نظمیں راشد سے ذرا پہلے شائع ہونا شروع ہو گئی تھیں لیکن ان کا پہلا مجموعہ راشد کے پہلے مجموعہ ''ماورا'' کے بعد میں یعنی ۱۹۴۸ء میں منصۂ شہود پر آیا۔ راشد کی نظموں کے کچھ نمونے ملاحظہ کیجیے:

''مفت بن کر اور ڈر جاتے ہیں لوگ
اور چپکے سے سرک جاتے ہیں لوگ
دیکھنا یہ مفت کہتا ہے
کوئی دھوکا نہ ہو؟
ایسا کوئی شعبدہ پنہاں نہ ہو
گھر پہنچ کر ٹوٹ جائیں
یا پگھل جائیں یہ خواب
بھک سے اڑ جائیں کہیں
یا ہم پر کوئی سحر کر ڈالیں یہ خواب
جی نہیں کس کام کے؟
ایسے کباڑی کے یہ خواب
ایسے نابینا کباڑی کے یہ خواب
(اندھا کباڑی، گماں کا ممکن)

جہاں زاد اس دور میں روز، ہر روز
وہ سوختہ بخت آ کر
مجھے دیکھتی چاک پر پابہ گِل سر بزانو
تو شانوں سے مجھ کو ہلاتی
(وہی چاک جو سال ہا سال جینے کا تنہا سہارا رہا تھا)
وہ شانوں سے مجھ کو ہلاتی
''حسن کوزہ گر ہوش میں آ
حسن اپنے ویران گھر پر نظر کر
یہ بچوں کے تنور کیوں کر بھریں گے
حسن اے محبت کے مارے
محبت امیروں کی بازی
حسن اپنے دیوار و در پر نظر کر''
مرے کان میں یہ نوائے حزیں یوں تھی جیسے
کسی ڈوبتے شخص کو زیرِ گرداب کوئی پکارے
(حسن کوزہ گر، لا=انسان)

ن۔م۔راشد کی آزاد ہیئت کی نظموں کے اور اقتباس دیکھیے:

خداوندا
کیا آج کی رات بھی
تیری پلکوں کی سنگین چٹانیں
نہیں ہٹ سکیں گی
تجھے اے زمانے کے رودعدے ہوئے
آج یہ بات کہنے کی حاجت ہی کیوں ہو؟
تو خوش ہو
کہ تیرے لیے کھل گئی ہیں ہزاروں زبانیں
جو تیری زباں بن کے
شاہوں کے خوابیدہ محلوں کے چاروں جانب
شعلے بن کر لپکتی چلی جا رہی ہے
(درویش، ایران میں اجنبی)

ن۔م۔راشد کی تحریک آزادی پر لکھی نظم ''زنجیر'' کے مصرعے دیکھیے:

ظلم پروردہ غلامو، بھاگ جاؤ
پردۂ شب گیر میں اپنے سلاسل توڑ کر
چار سو چھائے ظلمات کو اب چیر کر
اور اس ہنگام باد آورد کو
حیلۂ شب خوں بناؤ
(زنجیر، ایران میں اجنبی)

راشد کو نئی ہیئت کا تجربہ کرنے پر مخالفت کا جو سامنا کرنا پڑا وہ تصدق حسین خالد کو نہیں کرنا پڑا۔ اس لیے تصدق حسین خالد کو راشد کی طرح مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ اس تمام تر بحث کے باوجود بھی کہا جائے گا کہ راشد اور میراجی ہی آزاد نظم کے اولین

شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا مزید لکھتے ہیں:

"راشد اور میرا جی ہی آزاد نظم کے اولین بانیوں میں شمار کیے گئے اور تنقیدی تحریروں میں انھی کے حوالے دیے جانے لگے اور انھی کو رجحان ساز قرار دیا جانے لگا اور یہ اس لحاظ سے بالکل بجا تھا کہ تسلسل اور تواتر سے انھی کی نظمیں رسائل میں چھپتی رہیں۔ میرا جی ۱۹۴۹ء میں انتقال کر گئے۔ اُس وقت تک ان کی نظموں کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا تھا۔ راشد جلد ہی نظم آزاد کے اہم شاعر کی حیثیت سے تسلیم کر لیے گئے۔"(۹)

ن۔م۔راشد نے بیسویں صدی کی شاعری میں جدید شعریات کو فروغ دیا۔ انھوں نے روایتی انداز سے باہر نکل کر شاعری کی۔ وہ بیسویں صدی میں اقبال کے بعد ایک اہم شاعر ہیں۔ ن۔م۔راشد آزاد نظم کے بانی ہیں کیوں کہ انھوں نے اس عہد میں غیر مستعمل ہیئت میں شاعری کی جو آسان کام نہیں تھا اور ان کی اس روایت شکنی کی بھر پور مخالفت ہوئی۔ ن۔م۔راشد ایک صاحب اسلوب، نئی ہیئت اور جدید شعریات کے شاعر ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔محمد فخرالحق نوری، ڈاکٹر، جہاد راشد، (لاہور: اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی، ۲۰۱۳ء)، ص ۱۶، ۱۷

۲۔محمد فخرالحق نوری، ڈاکٹر، جہاد راشد، (لاہور: اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی، ۲۰۱۳ء)، ص ۱۷

۳۔حنیف کیفی، ڈاکٹر، اردو نظم معرا اور آزاد ارتقا نظم، (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء)، ص ۴۵۴

۴۔ضیاء الحسن، ڈاکٹر، جہاد راشد، (لاہور: اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی، ۲۰۱۳ء)، ص ۷۷

۵۔آفتاب احمد، ڈاکٹر، ن۔م۔راشد شاعر اور شخص، (کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۹۵ء)، ص ۱۶

۶۔شیما مجید، مرتب، مقالات ن۔م۔راشد، (کراچی: بک ٹائم، ۲۰۱۱ء)، ص ۳۱۱

۷۔سعادت سعید، ڈاکٹر، نسرین انجم بھٹی، مرتب، ن۔م۔راشد بقلم خود، (لاہور: جی سی یونی ورسٹی، س ن)، ص ۳

۸۔خواجہ محمد ذکریا، ڈاکٹر، جہاد راشد، (لاہور: اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی، ۲۰۱۳ء)، ص ۱۱۱

۹۔خواجہ محمد ذکریا، ڈاکٹر، جہاد راشد، (لاہور: اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی، ۲۰۱۳ء)، ص ۱۱۲

ماخذ:

انور سدید، ڈاکٹر۔ اردو ادب کی تحریکیں۔ کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۵ء

آفتاب احمد، ڈاکٹر۔ ن۔م۔راشد شاعر اور شخص۔ کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۹۵ء

حنیف کیفی، ڈاکٹر۔ اردو نظم معرا اور آزاد نظم۔ لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء

خواجہ محمد ذکریا، ڈاکٹر۔ جہاد راشد۔ لاہور: اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی، ۲۰۱۳ء، ص

سروری، عبدالقادر۔ جدید اردو شاعری۔ لاہور: شیخ غلام علی سنز پبلشرز، ۱۹۶۷ء

سعادت سعید، ڈاکٹر، نسرین انجم بھٹی۔ ن۔م۔راشد بقلم خود۔ لاہور: جی سی یونی ورسٹی، س ن

شیما مجید، مرتب۔ مقالات ن۔م۔راشد۔ کراچی: بک ٹائم، ۲۰۱۱ء

ضیاء الحسن، ڈاکٹر۔ جہاد راشد۔ لاہور: اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی، ۲۰۱۳ء

عابد علی عابد، سید۔ اسلوب۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۶ء

عابد علی عابد، سید۔ البیان۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۹ء

فرمان فتح پوری، ڈاکٹر۔ اردو شاعری کا فنی ارتقا۔ لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء

منیر الدین، بدر۔ بیسویں صدی کا شعری ادب۔ لاہور: پولیمر پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء

نوری، محمد فخرالحق، ڈاکٹر۔ جہاد راشد۔ لاہور: اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی، ۲۰۱۳ء

وزیر آغا، ڈاکٹر۔ اردو شاعری کا مزاج۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء

مضمون

محبتوں کا شہریار

اکرم باجوہ/بورے والا

محمود غزنی گزشتہ نصف صدی سے عروس غزل کی زلفیں سنوار رہا ہے اور اس طویل مشاقی کے بعد اس کی غزل کا جو روپ نکھر کر سامنے آیا ہے، اسے دیکھ کر شوکیس میں پڑی جاپانی گڑیا بھی حیرت سے پلکیں جھپکانے لگی ہے۔ یہ غزل مریم کی طرح مقدس، صندل کی خوشبو کی طرح معطر اور مونا لیزا کی مسکراہٹ کی طرح امر ہے اور اس کا دلآویز سراپا دشت بے نوا کی آغوش سے شمسی چاند بن کر طلوع ہو رہا ہے۔

یہ شاعری غزل کی آفاقی اقدار کا حسین امتزاج اور محمود غزنی کی شفاف سوچوں کا شاہکار ہے، جس کی ریشمی بنت جاڑے کی چاندنی کی طرح گلابی ہے اشعار کی تہوں میں چھپا ہوا درد، صحیفہ جاں پر ستارہ وار اترتا ہے اپنی اس شاعری کے حوالے سے بلاشبہ محمود غزنی اقلیم درد کا بادشاہ اور محبتوں کا شہریار ہے۔

حساس شاعر نے اپنے شعری رویے سے جو تاج محل تراشا ہے اس پر دھنک کی کل رنگ، قوسیں وارفتگی سے خیمہ زن ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہوا بادلوں کا دروازہ کھول رہی ہے اور خوشبو کی منڈیر پر دست حنائی کا چراغ جل اٹھا ہے۔

جب آندھی بارش اور ژالہ باری کے بعد پرندے اپنے گھونسلوں سے نکل کر سنہری دھوپ میں ایک دوسرے سے ہم کلام ہوتے ہیں تو محمود غزنی کی شاعری کا منظر نامہ بنتا ہے۔ یہ خوبصورت شاعری رات کی رانی کے پیڑ پر تتلیوں کا رقص بے خودی ہے اشکوں سے پھوٹتی ہوئی کونپل ہے۔ خانہ بدوشوں کے خیمے میں دہکتا ہوا الاؤ ہے۔ دھند کی چادر کے پس منظر میں مسکراتا ہوا موسم گل ہے۔ برف باری کے بعد مہکتا ہوا جنگلی گلاب ہے۔ سنگلاخ چٹانوں کے سینے سے پھوٹنے والے جھرنوں کی راگنی ہے اور فرشتوں کے قدموں کی مقدس چاپ ہے۔

محمود غزنی کی شاعری میں غم جاناں اپنی تمام تر شدت کے ساتھ موجود ہے لیکن اس کے برعکس اس کے کلام میں غم دوراں، سماجی شعور اور عصری آگہی کا حوالہ، رہگزار میں کسی تنہا پیڑ کی صورت ملتا ہے یا یوں کہیے کہ کسی شوریدہ سر دریا کے دامن میں ناؤ ہے کوئی گمنام جزیرہ ہے یا صدیوں پیاسی دھرتی پر برشگال رت کی بشارت کا لمحہ ہے حسین ہونٹوں کی لرزش خفی ہے۔ بہار کے پہلے شگوفے کی آنکھ ہے یا آسماں کی ہتھیلی پر کہکشاں کی ایک لکیر۔

آوازوں کے اس سمندر میں محمود غزنی کی غزل کا زمزمہ لیے اس کے مسلک محبت کی گواہی اجالا اور حسین کائنات بن کر مسکرا رہا ہے۔ اس نے سرگوشی کرتے ہوئے لمحوں کو گرفتار کیا ہے۔ خوشبو کو اسیر کیا ہے اور اشکوں کو پلکوں کی سلاخوں میں مقید کر دیا ہے اور بے چراغ جھونپڑے میں بیٹھ کر اپنے لفظوں سے وہ آفتاب و ماہتاب تراشے ہیں جو اردو غزل کی آبرو ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ غزل کی وہ حسین روایت جو میر تقی میر سے سفر کرتی ہوئی اختر شیرانی، ناصر کاظمی اور احمد فراز سے ہو کر محمود غزنی تک پہنچی ہے اس نے اس کا والہانہ استقبال اور پورا پورا احترام کیا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں محبت کی وہی مشعل ہے اور دوسرے ہاتھ میں شاخ زیتون لیکن حبس موسموں کے تیروں نے شکستہ جاں کو اس طرح چھلنی کر دیا ہے کہ آنکھوں کا سارا پانی لہو بن کر آبلوں میں سمٹ آیا ہے اس کے باوجود وہ ایک ایسے دشت کی مسافت کر رہا ہے جس میں اسے اپنی آواز کی بازگشت بھی سنائی نہیں دیتی وہ اپنی تمام تر قوتوں کو مجتمع کر کے خشک ہونٹوں سے ایک آواز بلند کرتا ہے اس کی یہ آواز دشت بے صوت کے خلاف ایک تنہا مسافر کا احتجاج بھی ہے اور اس کی شاعری کی معراج بھی۔

عارف خستہ کے بغیر

(لطیف الزماں خاں کی یاد میں)

مرتب: ڈاکٹر عبدالسلام

صفحات: 536 قیمت: 790 روپے

ناشر: بیکن بکس، غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

بیکن بکس، گلگشت کالونی، ملتان

042-37320030

چھمکاں

(سرائیکی شعری مجموعہ)

شاعر: محمد اقبال بالم

صفحات: 136 قیمت: 400 روپے

ناشر: اُردو سخن آرٹ لینڈ گرلز کالج لیہ

0302-7844094

عارف منصور (ملتانی)

زاہد محمود شمس/ملتان

عارف منصور (ملتانی) انتہائی منکسرالمزاج، سنجیدہ طبع اور تقدیس خیال کے حامل انسان تھے۔ انھیں "تھے" لکھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے میری آنکھوں کی طرح قلم کی نوک سے بھی آنسو رواں ہوں۔ میرے ہمراہ قلم بھی جیسے اُن کی یادوں کے خوبصورت گلشن کی مہکار سے معطر ہو جاتا ہو۔ وہ 7 فروری 2016 کو اس دارِ فانی سے چلے گئے۔ مگر اُن کی وفات مجھ سمیت بے شمار اُن کے چاہنے والوں کے لیے انتہائی دکھ کا باعث ہے۔ ایک ایسے انسان کی قربت سے محروم ہونا جن کی ہر بات سے سچائی، خلوص اور شفقت کے سمندر اُمڈتے ہوں وہی جان سکتا ہے جس کے ہاتھ سے کسی اندھیر نگری کے چوراہے پر اُنگلی چھڑا دی گئی ہو۔

میری اُن سے پہلی ملاقات 1999 کو ملتان پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ، ملتان میں منعقدہ ایک نعتیہ مشاعرے میں ہوئی۔ اس پہلی ملاقات میں اُن کی قابلیت اور محبت نے اتنا متاثر کیا کہ اپنی پہلی کتاب "پیامِ شمس" کا مسودہ لیے اُن کی خدمت میں ملتان ائیرپورٹ اُن کے آفس جہاں وہ "چیف سیکورٹی آفیسر" کے فرائض سرانجام دے رہے تھے مضمون لکھوانے کے لیے حاضر ہوا۔ انھوں نے دو دن میں ہی ایک جامع مضمون لکھ کر مجھے سونپ دیا۔ کتاب چھپ گئی اور رونمائی کا وقت آ گیا۔ ان کی خاص محبت اور شفقت کا اندازہ لگائیں کہ انھوں نے تقریب میں شرکت کرنے والے مہمانوں کے لیے ایک گاڑی مخصوص کر دی۔ تقریب خیر و عافیت سے انجام کو پہنچی لیکن اُن کے ساتھ پیار کا سلسلہ بڑھتا گیا۔ اکثر ان کے ہاں جانا ہوتا۔ اکٹھے کھانا پینا ہوتا اور شطرنج کی بازی بھی لگاتے۔ شطرنج میں نے انھی سے سیکھی اور اکثر وہ کھیل کے دوران مجھے کہتے کہ لگتا ہے کہ ایک دن تم مجھے ہرا دو گے اور میں ہر بار نفی میں سر ہلا دیتا۔ ایسی بہت سی خوبصورت یادیں اُن کے ساتھ وابستہ ہیں۔ جنھیں لکھنے بیٹھوں تو لکھتا ہی چلا جاؤں گا۔

اُن کی تخلیقات اور فن کے خزانے سے چند موتی چُن کر پیش کرتا ہوں۔ انھوں نے غزل کہی اور خوب کہی جس میں اُن کا میلان اور مطالعہ خوب آشکار ہوتا ہے۔ ان کے کلاسیکل آہنگ میں خوبصورت اشعار بکثرت ملتے ہیں۔ اصل بات ان کے ہاں ہونے والی ایک خاص تبدیلی تھی کہ وہ نعت کی طرف آ گئے اور اُن کے کلام میں ایک اور طرح کا طرزِ احساس آ گیا کہ جس پر باریابی کی مہر نظر آنے لگی ہے۔ حمد و نعت ہی اُن کو مرغوب ٹھہری۔ ذرا حمد کا شعر دیکھیں:

شکر تیرا ادا کس طرح میں کروں
اپنے محبوب کا اُمتی کر دیا

اسی طرح صنفِ نعت میں اُن کا ذوقِ نعت ماہِ کامل کی طرح ادب کے اُفق پر چمکتا دمکتا رہا ہے اور ان شاء اللہ رہے گا۔

نعت کے دو اشعار پیش کرتا ہوں:

ایسا ہوتا ہی نہیں اور کسی چوکھٹ پر
آرزوئیں جو کریں پوری بھی ہو جائیں
اُن کی دربانی کا مل جائے اگر مجھ کو شرف
میری نسلیں بھی مقدر کی دھنی ہو جائیں

ربِ کائنات سے دعا ہے کہ انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیں اور اُن کے چاہنے والوں کو صبرِ جمیل۔ آمین

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیرِ ادارت شائع ہونے والا مجلّہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگِ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ پندرہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے
اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہِ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمرا: j-24 ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

طنز و مزاح

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے "والی" میں

عطاء الحق قاسمی / لاہور

جیسا کہ میں اپنے ایک گزشتہ کالم میں بتا چکا ہوں انصاف مرحوم اور ان کی تین بہنیں، عدالت بیگم، شجاعت بیگم اور صداقت بیگم اسلام آباد میں دفن ہیں۔ ان کے ایک چچیرے بھائی خواجہ بے وفا لاہوری نے 12 اکتوبر 1999ء کو انتقال کیا، مگر ابھی وہ دفن نہیں ہوئے جس کی وجہ سے علاقے میں تعفن پھیلا ہوا ہے۔

انصاف مرحوم اور خواجہ بے وفا لاہوری کا کچھ احوال میں اس سے پہلے کہیں بیان کر چکا ہوں آج مجھے ان کی ہمشیرگان عدالت بیگم، شجاعت بیگم اور صداقت بیگم کا احوال بیان کرنا ہے، سب سے پہلے عدالت بیگم کا تذکرہ ہو جائے:

جب میں نے پہلی دفعہ عدالت بیگم کو دیکھا اس وقت وہ ایک گھریلو خاتون تھیں، سارا وقت گھر پر گزارتی تھیں بلاضرورت کسی سے نہیں ملتی تھیں، اسلامی علوم خصوصاً فقہ میں انہیں مہارت حاصل تھی؛ چنانچہ لوگ ان سے مختلف مسائل کے بارے میں رائے لیتے بلکہ عائلی تنازعات کے فیصلے بھی انہی سے کرواتے، عدالت بیگم کی زندگی بہت سادہ تھی، چھوٹے سے گھر میں رہتی تھیں، کہیں آنے جانے کے لیے بس میں سفر کرتیں ان کے عقیدت مند انہیں زندگی کی ہر آسائش کی پیشکش کرتے رہتے تھے لیکن انہوں نے دنیاوی آسائشوں کے لیے دل میں کبھی رغبت محسوس نہیں کی، ان کے علم و فضل اور عائلی تنازعات میں بے لاگ فیصلوں کے علاوہ ان کی زندگی کے اس درویشانہ انداز کی وجہ سے بھی پورے علاقے میں ان کے لیے بے پناہ عزت اور احترام پایا جاتا تھا۔

مگر ایک دن اچانک ان کی زندگی میں ایک ایسا موڑ آیا جس نے ان کی کایا پلٹ کے رکھ دی۔ شہر میں ایک نئے حاکم کی آمد کا شہرہ ہوا، یہ حاکم علم دوست تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کے ظلم و جبر کی داستانیں بھی بہت عام تھیں، اس نے ایک دن عدالت بیگم کو پیغام بھیجا کہ وہ ان کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہے، عدالت بیگم اگرچہ بلاضرورت کسی سے نہیں ملتی تھیں مگر انہیں اس حاکم کا انداز اچھا لگا کہ اپنے تمام تر اختیارات کے باوجود اس نے عدالت بیگم کو اپنے ہاں بلانے کی بجائے ان کے پاس آنے کی درخواست کی تھی۔ اجازت ملنے پر حاکم شہر ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو کسی نے سچ کہا ہے کہ "دل پر کسی کو اختیار نہیں" چنانچہ عدالت بیگم ایسی پارسا اور متقی خاتون پہلی نظر ہی میں اسے دل دے بیٹھیں، حاکم شہر نے بھی انہیں پہلے اپنے دل میں اور پھر اپنے محل میں جگہ دی، میں نے دیکھا تو نہیں لیکن سنا ہے کہ اس کے بعد عدالت بیگم کے طور اطوار دیکھنے والے تھے۔ ہر وقت زرق برق لباس اور زیورات میں لدی پھندی رہتی تھیں، ان کی چوکھٹ پر بڑے بڑے امراء ان کے حکم کے منتظر رہتے تھے۔ ان کے پاس سواری کے لیے عالیشان گاڑیاں اور بیرون ملک سفر کے لیے مختلف ایئرلائنوں کے ٹکٹ ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔

پر کرنا خدا کا یہ ہوا کہ حاکم شہر انتقال کر گیا اور یوں عدالت بیگم نے خود کو بھری دنیا میں تنہا محسوس کرنا شروع کر دیا۔ امراء نے اس سے آنکھیں پھیر لیں اور جو خدام ہر لحظہ اس کے حکم کے منتظر رہتے تھے وہ اس کے سائے سے بھی کترانے لگے۔ اس عرصے میں عدالت بیگم کی حالت دیدنی تھی انہیں آسائشوں اور کروفر کی عادت پڑ چکی تھی چنانچہ وہ بے چینی سے نئے حاکم کی آمد کی منتظر تھیں تاکہ اسے اپنی خدمات پیش کر سکیں نیا حاکم عدالت بیگم سے زیادہ عدالت بیگم کا چاہنے والا نکلا، صرف یہی نہیں بلکہ اس کے بعد آنے والوں نے بھی عدالت بیگم کو اور عدالت بیگم نے انہیں مایوس نہیں کیا۔

آخری دنوں میں زہد و تقویٰ کے علاوہ عدالت بیگم کے چہرے کی چمک بھی ماند پڑ گئی تھی۔ ان کا علم بھی گہنا گیا تھا صاحبانِ اقتدار کی صحبت نے ان کی روح کو بھی گہنا کر رکھ دیا تھا۔ انہیں اس زیاں کا احساس تھا انہیں وہ دن یاد آتے تھے جب وہ ایک باپردہ گھریلو خاتون تھیں۔ جب وہ آسائشوں اور کروفر کے بغیر سادہ زندگی گزارتی تھیں جب خلقِ خدا ان کے فیصلوں پر آنکھیں بند کر کے ایمان لاتی تھی اور ان کے راستے میں آنکھیں بچھاتی تھی۔ یہ سب کچھ یاد آنے پر ان کی اور ان سے محبت اور عقیدت رکھنے والوں کی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں لیکن خواہشات کے جس دائرے میں وہ گھر گئی تھیں اس سے نکلنا اب ان کے لیے آسان نہیں تھا، ایک دن اسی طرح کسی حکم کی تعمیل کرتے اور اپنے اس رویے پر گریہ کرتے ہوئے ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے "والی" میں......!

دل نرم جو قفسوں سے صیاد نہیں کرتے
ہم صید بھی کسی ہی فریاد نہیں کرتے
اس شہر کے شاعر بھی کس وجہ ہیں شرمیلے
کہتے تو بہت کچھ ہیں ارشاد نہیں کرتے
ہم زیست کی سب گھڑیاں قربان کریں اس پر
تم وقت محبت پر برباد نہیں کرتے
سینے میں دبا رکھیں پر باندھ کے آئیں ہم
پنجرے سے پرندوں کو آزاد نہیں کرتے
پتے بھی عجب شے ہیں گر جائیں خوشی سے
شاخوں سے جدا ہو کر نہ یاد نہیں کرتے
اس شام جدائی میں کیا نغمہ سرائی ہو
ناشاد فضا سے ہم دل شاد نہیں کرتے
خط لکھ کے رو یار اپنے پردیس میں ثاقب کو
کیوں شاد نہیں رکھتے کیوں یاد نہیں کرتے

آصف ثاقب/بوئی ہزارہ

کبھی اشکوں کی زبانی کبھی سرگوشی سے
بات تھمتی ہے تو بن جاتی ہے خاموشی سے
اب بہر طور تمہیں سامنے آنا ہوگا
تھک آ جاؤ گے ہر روز کی روپوشی سے
زندہ رہنے کو نہیں شور شرابا درکار
زندگی یوں بھی گزر جاتی ہے خاموشی سے
علم کا بخش دیا اس نے سمندر مجھ کو
واقف حال تھا وہ میری بلا نوشی سے
اتنی جلدی بھی نہیں ترک تعلق بہتر
خود ہی مر جائے گا وہ زود فراموشی سے

آخرت میں بھی وہی عیب چھپائے گا مرے
کام لیتا ہے جو دنیا میں خطا پوشی سے
کٹ ہی جائے گی محبت کی مسافت خورشید
ہوشمندی سے کبھی اور کبھی مدہوشی سے

خورشید بیگ میلسوی/میلسی

یہ کارخانۂ ہستی مری نمود سے ہے
قیام صبح ازل بھی مرے وجود سے ہے
دکھا رہی ہے مجھے، حاصل صدائے "دشمن
وہ روشنی جو مرے قلب میں درود سے ہے
دل و دماغ پہ سایہ ہے خود پرستی کا
جبیں نشان زدہ، کثرت سجود سے ہے
وہ، جن کا علم ہی سب سے بڑی فضیلت تھا
اب ان کا نام اگر ہے تو کیل کود سے ہے
مجھے زمین سے نسبت سہی مگر آکاش
مرا جہان مری آنکھ کی حدود سے ہے

احمد سجانی آکاش/لاہور

خرد کی چال میں دل کو کبھی نہ آنے دے
جنوں کی خیر، کسی پل نہ تسکین پانے دے
اسے میں اس کے سراپا سے روشناس کروں
کسی طرح وہ اگر آئینہ دکھانے دے
اگر وہ توڑ کے رکھ دے ترے ارادوں کو
اگر وہ تجھ کو مقدر نہ آزمانے دے
کمال فن سے نظر، آشنا تو ہو جائے
جہان کن کو مری آنکھ میں سمانے دے

کوئی تو یاد کرے مجھ کو میرے نام کے ساتھ
بنام زیست مجھے کچھ تو چھوڑ جانے دے
نقاب اٹھا بھی دے رخ سے طلوع صبح جمال
شب دراز کی زلفوں کو پیچ کھانے دے
چراغ محفل تنہائی کے اجالے کو
سیاہ رات کی ہمت پہ مسکرانے دے
چمک اٹھے گی عرق سے جبین پیر فلک
غبار وحشت گریہ کو سر اٹھانے دے
اب اپنے بت کو گرانے بھی دے مجھے آکاش
نگاہ دل میں کوئی انقلاب لانے دے

احمد سجانی آکاش/لاہور

یہ آفتوں کا سلسلہ مرے لیے نیا نہیں
مگر مجھے یہ فخر ہے کہ میرا سر جھکا نہیں
رقابتوں کی لہر نے ہمیں فنا کیا نہیں
قد آوروں کے درمیاں ہمارا قد گھٹا نہیں
تمہارے ساتھ کون ہے، مرے خلاف کون ہے
تمہی کو ہوگی سب خبر، مجھے تو کچھ پتہ نہیں
دلوں میں ہیں جو حوصلے، لہو میں جوش ہے اگر
کوئی ستم، ستم نہیں، کوئی بلا، بلا نہیں
بشر بہت ذہین ہے، بشر بہت عظیم ہے
مگر رہے یہ ذہن میں، کوئی بشر خدا نہیں
امیر ہو، غریب ہو، وہ خود ہی جرم سے بچے
نگاہ عدل میں کوئی، سزا سے ماورا نہیں
کبھی تھیں جس کی شہرتیں، کبھی تھا جو عروج پر
اب اس ادیب شہر کا، کہیں اتہ پتہ نہیں

وہی ہے سب سے محترم کہ جس نے اپنی زیست میں
کبھی برا کیا نہیں، کبھی برا سنا نہیں
مضائقہ نہ ہو کوئی، تو خوب چھپائیے
کلام خوب کیجئے، اگر وہ ناروا نہیں
ہوا تو دستیاب ہے گر نہیں مہک بھری
چمن تو ہے نصیب میں مگر ہرا بھرا نہیں
کبھی کبھی حیات کا بس اک یہی سبب رہا
مجھے تھی جس کی جستجو وہی مجھے ملا نہیں
ترے گھر سے دور ہوں، رکاوٹیں ہیں اور بھی
اگر میں تیرے دل میں ہوں تو کوئی فاصلہ نہیں
وہ کون ہو، کہ جا کے جو، تجھے یقیں دلا سکے
کہ راشد حزیں ترا، تجھے بھلا سکا نہیں

محمد ممتاز راشد لاہوری/لاہور

ٹھہر گیا ہوں کہیں خود کو دیکھتا ہوا میں
تری تلاش میں نکلا تو آئینہ ہوا میں
مجھے تلاش کرو گے، کہاں کہاں آخر
کہ اپنی ذات کے حصوں میں ہوں بٹا ہوا میں
بنا کے آئینہ تم چھوڑ کر گئے تھے جہاں
ہمیشہ رہتا ہوں، اس موڑ پر سجا ہوا میں
خود اپنے آپ کو محسوس ہونے لگتا ہوں
ترا فسانہ حقیقت میں ڈھالتا ہوا میں
زمیں سے واسطہ اپنا میں توڑ بیٹھا ہوں
فلک کی سمت ستارے اچھالتا ہوا میں
نہ منزلوں کے نشاں ہیں نہ ہمسفر کوئی
یہ آج دور ہے یہ ہوں، کھڑا ہوا میں
فلک پہ چاند ستاروں سے بات کرتا ہوں
زمیں پہ نقش قدم کی طرح پڑا ہوا میں
یہ کس مقام پہ پہنچا دیا ہے خالد کو
ترے فراق میں تصویر بنا ہوا میں

میجر (ر) خالد نصر/لاہور

کچھ کہو سکوں بتاؤں دل میں خیال آیا
جملہ تمام بگڑا ایسا ملال آیا
تسکین کی ڈگر کو نوحہ گری نے جکڑا
وہی سفر کو بے شک ہر دن زوال آیا
امکان کا خیاباں ڈوبا تھا تیرگی میں
اک ارتقا کو آخر حتمی کمال آیا
خامشیوں سے پہلے آندھی میں زلزلہ تھا
ہر سو نشان ٹوٹا اندر وبال آیا
اک ریت کی اداسی کھڑکی میں بھر گئی تھی
کھڑکی کو توڑنے کا کڑوا کدال آیا
خوابوں میں روشنی کی چیخوں سے ڈر گیا میں
راتوں کی منزلوں میں تیرہ دھمال آیا
نعماںؔ اب تصور کچھ بھی نہیں ہے نادر
آہوں کے زیر و بم پر اشکوں کا حال آیا

نعمان احمد ہاشمی

شعلوں میں ڈھالتی ہے وہ جذبات آج کل
آنکھوں میں تھم چکی ہے جو برسات آج کل
سڑکوں پہ احتجاج کا بے ربط شور ہے
بگڑے ہوئے ہیں شہر کے حالات آج کل
دشمن بھی دوستی کے لبادے میں آگئے
تقدیر کر رہی ہے کرامات آج کل
ثابت ہوا کہ وقت ہمارے خلاف ہے
دیتا نہیں ہمارا کوئی ساتھ آج کل
کرتی ہے بس فنا وہ غریبوں کی بستیاں
ہوتی ہے آسماں سے جو برسات آج کل
آیا ہے کس بھنور میں مرے شہر کا امیر
کرتا ہے دل جلوں سے ملاقات آج کل
شاہدؔ ہمارا عہد مثالی ہے اس لئے
ڈوبے ہوئے ہیں خون میں دن رات آج کل

ہمایوں پرویز شاہد/لاہور

کبھی کبھی یوں حیرت ہوتی ہے بابا
اپنے آپ سے وحشت ہوتی ہے بابا
بابا میں تو یونہی رونے لگتا ہوں
ہجر کی اپنی لذت ہوتی ہے بابا
آنکھ اسی کے رستے میں رکھ آتے ہیں
آنکھ کو جس کی عادت ہوتی ہے بابا
بابا میرا حال تو، تو نے دیکھا ہے
میری کیسی حالت ہوتی ہے بابا
گھر کو چھوڑ کے آگے چلتا رہتا ہوں
جانے کیسی عجلت ہوتی ہے بابا
بابا جی کیا میں نے بھی مر جانا ہے
جینا ایک کرامت ہوتی ہے بابا
اپنے آپ سے ملنے کو چل پڑتا ہوں
دنیا سے جب فرصت ہوتی ہے بابا
ان کے اندر نور اسدؔ بھر آتا ہے
جن کو تم سے نسبت ہوتی ہے بابا

اسد عباس خان/جھنگ

آخری ہجر ہے آخری آگ ہے
کیا یہی عشق ہے کیا یہی آگ ہے
خاک دم ہو چکی، آگ تم ہو چکی
یہ نئی خاک ہے یہ نئی آگ ہے
یعنی اشیاء کی ہیئت بدلتی ہوئی
نیلگوں وصل میں سرمئی آگ ہے
دونوں ہاتھوں سے مجھ سے بکھرتے ہوئے
بھربھرے حرف ہیں بھربھری آگ ہے
اپنا حصہ اٹھائیں یہاں سے چلیں
یہ تری آگ ہے یہ مری آگ ہے
دے رہی ہے طراوت مجھے ہر نفس
یہ جو مجھ میں بھڑکتی ہوئی آگ ہے

شاعری

مجھ میں الفت اگر دیکھو تو غور سے
عشق ہی عشق ہے آگ ہی آگ ہے

حسین الفت بلوچ/جھنگ

ستارا بھی دیے جیسا لگتا ہے
جو کمرے میں مرے روشن ہوا ہے
وہ پھولوں کی طرح رہنے لگا ہے
وہ جب جب بھی ملا تازہ ملا ہے
یہ کیا کیا خواب پیالے میں پڑے ہیں
کوئی ان کو اکیلا دیکھتا ہے
لہو اب آنکھ رو رو تھک گئی ہے
اب ان میں سے ٹپکنے لگا ہے
اٹھاؤ اپنی مٹی اور چاؤ
میاں ہجرت کا لمحہ آ گیا ہے
یہاں میرے سوا کوئی نہیں ہے
مگر وہ آئینہ میرے سوا ہے
میں اول بھی ہوں آخر بھی ہوں طائر
مرا تو بس یہی اک معجزہ ہے

محمد الیاس طائر

نقاب زلف جو رخ پہ گرا گرا سا لگا
گھٹا میں حسن کا سورج چھپا چھپا سا لگا
وہ اب ملا تو بظاہر خفا خفا سا لگا
وہ مجھ سے مل کے بھی یارو جدا جدا سا لگا
مزاج اس نے نہ پوچھا مگر سلام لیا
یہ روٹھنے کا سلیقہ بھلا بھلا سا لگا
میں اپنے کرب کی روداد اس سے کیا کہتا
خود اس کا دل بھی مجھے کچھ دکھا دکھا سا لگا
غبارِ وقت نے کچھ یوں بدل دیئے چہرے
کہ اپنا شہر بھی مجھ کو نیا نیا سا لگا
گھٹی گھٹی سی لگی رات انجمن کی فضاء
چراغ جو بھی تھا روشن بجھا بجھا سا لگا
جو ہم پہ گذری ہے شاید سبھی پہ گذری ہے
فسانہ جو بھی سنا وہ سنا سنا سا لگا
میں گھر سے چل کے اکیلا یہاں تک آیا ہوں
جو ہمسفر بھی ملا وہ تھکا تھکا سا لگا
وہ مسکراتا سا چہرہ چمن میں اے رفعت
ہر ایک پھول سے بڑھ کر کھلا کھلا سا لگا

رفعت علی علوی/لاہور

ہم آپ رہتے ہیں جس میں مکان دھوپ کا ہے
ستم مزید یہ کہ سائبان دھوپ کا ہے
بھلا اب اس سے بڑا حشر اور کیا ہوگا
زمین دھوپ کی ہے آسمان دھوپ کا ہے
خود اذیتی کی ہمیں پڑ چکی ہے لت ایسی
کہ گھر کے سائے تلک پہ گمان دھوپ کا ہے
نہ بجھنے دے گا تری میری دشمنی کا الاؤ
جو بغض کا یہ شرر درمیان دھوپ کا ہے
ہیں کیا عجیب مسافر ہے کیا عجیب سفر
سفینہ ریت کا ہے بادبان دھوپ کا ہے
شجر کے پیڑ تلے سانس لی تو بھید کھلا
ذرا سا چھاؤں کا باقی جہان دھوپ کا ہے
اسی سے عالمِ ہستی میں رنگ دھنک ترنگ

نجمہ یاسمین یوسف/لاہور

دیارِ شوق میں آئے تھے ایک خواب کے ساتھ
گزر رہی ہے مسلسل کسی عذاب کے ساتھ
ہم اہلِ درد پکارے گئے صحیفوں میں
ہم اہلِ عشق اتارے گئے کتاب کے ساتھ
پھر ایک شام پذیرائی چشمِ تر کی ہوئی
پھر ایک شام گزاری گئی جناب کے ساتھ
کچھ اور چاہیے تشنہ لبی مٹانے کو
یہ پیاس وہ ہے جو بجھتی نہیں شراب کے ساتھ
ہمیں یہ خوف اندھیرے نگل نہ جائیں کہیں
سو ہم نے جسم کو ڈھانپا ہے آفتاب کے ساتھ
زحیم وہ مری دنیا دلی سے ڈرتا ہے
وہ مجھ سے ملتا ہے لیکن بڑے حساب کے ساتھ

زحیم رشید/بورے والا

جنبشِ ارض و سماوات میں آئے ہوئے ہیں
آج کل گردشِ حالات میں آئے ہوئے ہیں
اب جو تو چاہے جہاں چاہے ہمیں لے جائے
کیا کریں ہم جو ترے ہات میں آئے ہوئے ہیں
میں اکیلا تو نہیں آیا تجھے دیکھنے کو
کچھ ستارے بھی مرے سات میں آئے ہوئے ہیں
اے مہ چار دہم تیری خوشی کی خاطر
اک سیہ رات کی بہتات میں آئے ہوئے ہیں
میں بھی دن رات یہاں کوزہ گری کرتا ہوں
اس کے سب رنگ مری ذات میں آئے ہوئے ہیں
عشق خود آپ خرافات تمنا ہے زحیم
اس لیے دشتِ خرافات میں آئے ہوئے ہیں

زحیم رشید/بورے والا

محبت ہوگئی ہے کیا

نہ شب بھر نیند آتی ہے
نہ دن کو چین ملتا ہے
نہ کوئی آواز اب مرے کانوں کو بھاتی ہے
آنکھوں کو نہیں حاجت
کسی صورت کو تکنے کی
نہ لفظوں کو ضرورت ہے
کسی سے بات کرنے کی
موسم کے تھپیڑوں سے
نہیں اب فرق پڑتا
چندا کے اجالوں میں کشش اب کچھ نہیں مجھ کو
سورج کی تپش سے اب، نہیں جلتے میرے پاؤں
یہ کس کے خواب ہیں جو کہ
مجھے سونے نہیں دیتے
کبھی ہنسنے نہیں دیتے
کبھی رونے نہیں دیتے۔
یہ کس کی سرگوشیاں ہیں میرے کانوں میں
جو کچھ سننے نہیں دیتیں
یہ کس کی موہنی صورت ہے
جو کچھ تکنے نہیں دیتی
یہ کس کے لمس کا ہے قفل
مرے ہونٹوں پہ آ ٹھہرا
یہ کس کی مست آنکھوں کا
مرے تن من پہ ہے پہرا
اجالا کس کی یادوں کا
یہ من آنگن میں اترا ہے
یہ کس کی سانس کی گرمی سے سورج بھی پگھلتا ہے
یہ آتش میرے من میں جو
سلگتی ہے، بھڑکتی ہے
کیا اس کے دل کے اندر بھی
یہی آگ جلتی ہے؟
جدائی کے زمانوں میں
یہ حالت ہوگئی ہے کیا......؟
اسے بھی مجھ سے ایسی ہی
محبت ہوگئی ہے کیا............؟

سیدہ اسما جعفری/بھلوال

عجب سی خوش گمانی ہے

ذرا سی شادمانی ہے
عجب سی خوش گمانی ہے
ادھر والے کنارے سے
ادھر والا کنارہ
خوب تر ہوگا
نہایت پرفضا ہوگا
نہایت خوش منظر ہوگا
مگر اس خوش گمانی کو
ذرا سی شادمانی کو
منانے پر تلا ہے دل
اسے سمجھا رہی ہوں
ہوتے ہیں سب ایک سے ساحل
سو اچھا ہے کہ ناؤ اور چپو
جس جگہ ہیں اور جیسے ہیں
انہیں ویسے ہی رہنے دوں
اداسی اور ویرانی کو
خس بن کے موج بہنے دوں
ادھر والے کنارے کو
ابھی آباد رہنے دوں
دل ناشاد کو
حسن گمان سے
یاد رہنے دوں

نجمہ یاسمین یوسف/لاہور

دم سحر جو یہ اونچا نشان دھوپ کا ہے
اے میری سکھی کیا تجھ سے کہوں
میرے ہر گھر کے رستے سے
پہلے اس کا گھر پڑتا ہے
اس میرے سونے آنگن میں
جب ساجن آنے لگتا ہے
میں جانوں اس کی آہٹ پر
یہ اپنے کواڑ بجاتی ہے
اور مجھ کو خوب جلاتی ہے
یہ کوتا میری تن ہے
ان حرفوں کے اور ہاتھوں کے
کچھ ایسے جال یہ بنتی ہے
ساجن آئے مجھ سے ملنے
اور یہ اسے مل جاتی ہے
میں اپنے گھر کے جھروکوں سے
بس اس کوتا کا کرتی ہوں
اور خود میں کڑھتی رہتی ہوں
یہ کوتا میری سوتن ہے
یہ میرے سپنوں خوابوں کو
جو سارا دن میں چنتی ہوں

ساجن کے آنے تک
کاغذ کو بانٹ کے جاتی ہے
اور مجھ کو خوب جلاتی ہے
یہ کوتا میری سوتن ہے
جب جذبے برکھا لاتے ہیں
تو میرے سنگھار سے پہلے ہی
میرے اس مسی کا جل سے
لبوں کو رنگ پلاتی ہے
ساجن کو چھب دکھاتی ہے
اور مجھ کو خوب جلاتی ہے
یہ کوتا میری سوتن ہے

ثروت زہرا

آزادی

حرف اپنی نزاکت کھو چکے ہیں
آنکھ میں آثار ابھرے ہیں چٹانوں کے
مکانوں کے در و دیوار سنجیدہ ہوئے ہیں
روشنی آہن گروں کے روپ میں ڈھل کر
شب دیجور کی آواز کو پامال کر بیٹھی
گلابوں کو وہی بو باس پھر تفویض کر ڈالی
جیالوں نے لہو دے کر
زمیں کے جسم کو بخشی توانائی و رعنائی

انیس احمد/لاہور

ارتکاز

تمام معنوی حروف نئے جسموں میں بدل گئے ہیں
عجیب موسم کہ جگنوؤں نے بھی
آتشیں عہد ان کو اپنے بدن کا لقمہ قرار دے کر
حیات افروز ساعتوں کو سپردِ آتش کیا ہے ایسے
جو خاک افکار حالت انتشار میں تھی
اسے بھی اثبات کی شکل میں بدلنے کا اختیار تفویض کر دیا ہے
جو میں نے صدیوں کی ابتلاؤں کے بعد حاصل کیا تھا
وہ ارتکاز تحلیل ہو گیا ہے
مرا بدن جو زمین بھی، آسمان بھی تھا
نہ جانے کس نے یہ صور پھونکا
خلا میں روئی کے گالے بن کر بکھر گیا ہے
زمین پر کاروبارِ حیات ویسے ہی چل رہا ہے
مجھے بہت فکر ہے کہ میرے تمام افکار ناگ بن کر
مری اناؤں کو ڈس رہے ہیں
تمام معنوی حروف نئے جسموں میں بدل گئے ہیں

انیس احمد/لاہور

اکیسویں صدی

حروف گونگے ہیں، میں ہوں بہرا
مری نظر بھی اگرچہ بے نور ہو چکی ہے
ہوا بھی نوحہ کناں ہے
سورج ٹھٹھر کے خود میں سمٹ گیا ہے
زمین بھی اپنے نرم بستر میں منتشر ہو کے رہ گئی ہے
نہ کوئی ساگر چھلک رہا ہے
نہ کوئی لمحہ چھلک رہا ہے
نہ کوئی سایہ بھٹک رہا ہے
تمام چہروں پہ نرم سی جو شفق کھلی تھی
وہ آج بنجر نقوش میں کیوں بدل گئی ہے
تمام آنکھوں میں آگہی بے حسی نے ڈیرہ جما لیا ہے
ترے لبوں کی مٹھاس لمحوں نے چھین لیا ہے
ملال یہ ہے
کہ میرے پیشِ نظر کوئی راستہ نہیں تھا
ترے مسافر کے پاس زادِ سفر نہیں تھا
میں اپنی کشتیں بھی کھو چکا ہوں
نئی صدی کا نیا مسافر انیس احمد
عجیب بستی میں رک گیا ہے
ہر ایک گھر کے مکین سانسوں کی قید سادہ بھگت رہے ہیں
شجر پہ بیٹھے ہوئے پرندے اسیر آزادگی رہے ہیں
زمین پہ چیونٹیاں قطاریں بنائے ساکن کھڑی ہوئی ہیں
چنار سے چاندنی زمیں کے بدن میں چھپنے کو چھن رہی ہے
تمام آنکھوں میں ایک خواہش کے سرخ ڈورے
پڑے ہوئے ہیں
خلوص، مہر و وفا، محبت کی بات کیسے کوئی کرے گا
ہر اک نظر میں لکھا ہوا ہے ملال بے سود چاہتوں کا
نئی صدی کا نیا مسافر
نئی صدی کے سفر کو تنہا بھگت رہا ہے
حروف گونگے ہیں، میں ہوں بہرا
مری نظر بھی اگرچہ بے نور ہو چکی ہے
ہوا بھی نوحہ کناں ہے
سورج ٹھٹھر کے خود میں سمٹ گیا ہے
کوئی بھی اب موسموں کی باتیں نہیں ہے کرتا
کسی کو بھی موسموں کی تبدیلیوں سے اب واسطہ نہیں ہے
ہوائیں ویران ساحلوں کے گلے سے لگ کر سسک رہی ہیں
کوئی ہواؤں کی آہ و زاری نہیں سمجھتا

انیس احمد/لاہور

سفرنامہ

چار دن وادیٔ کشمیر میں

ایم آر شاہد/لاہور

سفر کا حال لکھنے سے پہلے کچھ اس علاقے کی مختصر تاریخ کا ذکر ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو بے شمار وسائل سے نوازا ہے۔ فلک بوس پہاڑ، بہتے دریا، خوب صورت جھیلیں، رواں دواں آبشاریں گنگناتے چشمے شور مچاتے جھرنے پھلوں اور پھولوں سے لدی خوب صورت اور دلکش حسین وادیاں ہمارے لیے قدرت کے بیش قیمت انعامات ہی تو ہیں۔ اس لیے ہم خوب صورت وطن سیاحت کی دولت سے مالا مال ہیں۔ خوب صورت جنت نظیر کشمیر اپنے اندر ایک تاریخ سمیٹے ہوئے ہے۔ ملتے ہیں اور بچھڑ جاتے ہیں ان میں کچھ لوگ اور حسین نظارے ہمیشہ کے لیے دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ جاتے ہیں ایسے ہی وادی کشمیر کے خوش رنگ نظارے ہیں۔ جو ہمیشہ یادوں میں تازہ رہیں گے۔ کشمیر صرف پاکستان ہی نہیں پوری دنیا کی سیاحت میں ایک ممتاز مقام کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں خوب صورت مناظر اور انمٹ نقوش والی نعمتوں سے گونجتی وادیاں ہیں۔ جہاں آپ زندگی کے چند ناقابل فراموش دن گزار سکتے ہیں۔ یہاں کسی بھی وادی یا پہاڑ کے قدموں میں جا کر واپس نکل کھڑے ہوئے۔ اس سے ہمارا دل برا ہوا۔ پر کسی پر زور نہیں چلتا۔ آخر کار عیدالاضحی سے ایک ہفتہ قبل اپنے دیرینہ دوست عبدالوہاب سے کشمیر جانے کا پروگرام بنایا تاکہ عید کی چھٹیاں وہاں گزاری جائیں۔ طے یہ پایا کہ عید کے دوسرے روز بدھ کے دن 14 ستمبر 2016ء رات کے وقت لاہور سے نکلا جائے۔ تین دن پہلے نیازی اڈے کے سامنے سے ایک APS ڈبہ چار یوم کے لیے 20000 روپے میں بک کرایا۔ یعنی فی یومیہ پانچ ہزار روپے جو قافلہ جانے کے لیے تیار

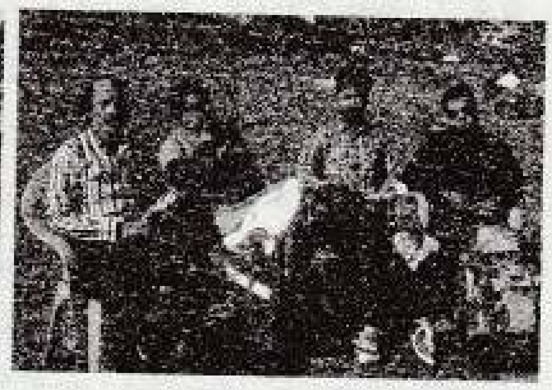

دنیا بھر میں 27 ستمبر کو سیاحت کا عالمی دن منایا جاتا ہے سیاحت کا یہ عالمی دن ورلڈ ٹورازم آرگنائزیشن کی ایگزیکٹو کونسل کی سفارشات پر جنرل اسمبلی کی قرارداد کے مطابق منایا جاتا ہے۔ سیاحت کا مطلب ہی سفر ہے۔ ویسے بھی زندگی ایک سفر ہے۔ جس میں لوگ اور قدرتی نظارے آنے کو جی نہیں چاہتا۔ کچھ ایسی ہی صورتحال ہماری رہی۔

ایک طویل عرصہ سے دل میں خلش تھی کہ کس دور دراز تفریحی مقام کا رخ کیا جائے۔ کبھی یہ خواہش دل میں جنم لیتی اور کبھی دم توڑ دیتی۔ یار دوست ایک بار ہمیں اکیلا چھوڑ کر خود سیر کے لیے ہوا۔ ان میں عبدالوہاب، محمود احمد، (فیصل آباد) ذکار الرحمٰن (فیصل آباد) عاصم کمال، ایم آر شاہد، ملک ریاض (الریاض آٹوز) شامل تھے۔ یہ قافلہ چھ افراد پر مشتمل تھا۔ یہ چھ کے چھ کردار بڑے عجیب و غریب تھے۔ ان میں ایک سنجیدہ ایک منچلا۔ ایک حد سے تجاوز کر جانے والا رنگین طبیعت، ایک

اپنی ذات، لے میں مست اوزان میں دو دل چلے جی تھے۔ جو گاڑی میں چلنے والے اپنی اپنی پسند کے گیتوں پر اپنی اپنی محبوباؤں کو یاد کر کے ٹھنڈی آہیں بھرتے۔ جنہیں دل لگی کے بعد وہ چھوڑ چکے تھے۔ جب سب دوست اکٹھے ہوگئے تو امیر جماعت کا انتظار کرنے لگے۔ کسی ذرائع سے معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے گھر والوں سے ابھی تک اجازت نہیں لی تھی۔ اور ان کے والد گرامی رانا سجاد علی نے اسے جانے سے انکار کر دیا ہے میں نے بار بار رابطہ کیا اس نے فون نہ اٹھایا آخر اس نے فون۔ میں نے پوچھا کہ ہمیں صحیح صورتحال سے آگاہ کرے اس پر عبدالوہاب نے بتایا کہ حاجی صاحب نے اجازت نہیں دی۔ حالانکہ اسے کم از کم ایک ہفتہ قبل بات کرنی چاہیے تھی پھر دوستوں سے پروگرام طے پاتا۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ آپ کے والد گرامی کا حکم سر ماتھے پر اگر وہ ناراض ہیں تو ہم نہیں جاتے پھر کبھی دیکھا جائے گا۔ میرے ساتھ اس کے دو دوست جو فیصل آباد سے برآمد ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی نفی میں جواب دیا۔ اس کے ایک دوست عاصم کمال اور ملک ریاض بضد رہے کہ ہم نے تو تیاری مکمل کی ہے۔ آخری سارا ملبہ میرے پر ڈالنے کی کوشش کی گئی کہ میں نہیں جاتا آپ قافلے کی سرپرستی کریں۔ میں نے جواب دے دیا کہ اگر آپ نہیں جا رہے تو میں نہیں جاؤں گا۔ بالآخر اس نے اپنے دوستوں کی ناراضگی مول لینا گوارا نہ کی اور ہمارے ساتھ بیگ اٹھا کر چل پڑا۔

رات دس بجے ہماری روانگی لاہور سے ہوئی۔ مزنگ چونگی پہنچے تو انہیں کوئی چیز یاد آ گئی۔ ارڈنگ

فون کرنے پر ان کے بڑے بھائی محمد بلال (انجینئر) نے وہ سامان وہاں گاڑی میں ہی پہنچایا۔ ہم سب کا ارادہ موٹروے سے جانے کا تھا مگر ڈرائیور بادشاہ قسم کا آدمی تھا۔ اپنا حکم صادر کرنے لگا کہ جی ٹی روڈ سے فاصلہ کم پڑے گا۔ خیر امیر قافلہ (ملک ریاض، عبدالوہاب) کی سرپرستی میں قافلہ گاڑی میں رواں دواں تھا۔ گوجرانوالہ کے قریب پہنچ کر ہمارے یار (اے ڈیلی) نے سر پکڑ لیا۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ یہ اپنے نئے کپڑے تو ملک ریاض کی دکان پر ہی چھوڑ آئے ہیں ان میں محمود اور ذکاء کے کپڑے بھی تھے۔ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے لاہور ایک دو دوستوں سے رابطہ کیا کہ کس طرح سے ہمارے کپڑے مری یا کشمیر کے کسی پوائنٹ پر پہنچا دو۔ ان دوستوں نے معذرت کی کہ عید کی چھٹیاں ہیں۔ یہ کام ناممکن ہے پھر خاموشی اختیار کر کے فیصلہ کیا کہ ایک دوسرے کے کپڑوں کا گزارا کر لیں گے پھر وہاں ایسا ہی ہوا۔

ملک ریاض جولی آدمی ہے۔ موبائل پر گانوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ بیچ میں ایک دوسرے کی فرمائش کا بھی خیال رکھا جاتا رہا خوب شور شرابا اور گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ان گانوں پر ہلکا پھلکا ڈانس بھی ہوتا رہا۔ عجیب سا تھا۔ میں ان دوستوں کی نازک اداؤں سے محظوظ ہوتا رہا۔ مری کے قریب صبح سات بجے ایک سڑک کے کنارے ہوٹل کے پاس رکے۔ مجھے اس دوران شیو بنانے کا بہانہ مل گیا۔ کیوں کہ میری روٹین ہے کہ جب تک صبح شیو نہ بنالوں مجھے الجھن سی رہتی ہے۔ اس وقت میرے بھتیجے عامر سعید کی بھیجی ہوئی مشین ریزر میرے کام آتی رہی۔ ونڈ بیگ سے مشین نکالی تو کھڑے کھڑے گاڑی کے پاس عبدالوہاب نے مجھ سے پکڑ کر میری دس منٹ میں شیو بنا ڈالی۔ اس کے بعد منہ ہاتھ دھویا تازہ دم ہو کر گاڑی میں آ بیٹھے۔ گاڑی پھر اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ مری پہنچ کر اترے اور پراٹھے اور چائے سے ناشتہ کیا۔ کوئی دوپہر کے وقت گاڑی مظفر آباد پہنچی وہاں سے عبدالوہاب نے تین چار کلو چکن بنوایا۔ بیف وہ گھر سے لے کر چلا تھا۔ بار بی کیو کا سارا انتظام تھا کوئلے، انگیٹھی، کولر، تیل، مصالحہ جات دہی وغیرہ۔

مظفر آباد مرغی والے سے اس کی تیغ کلاری ہوگئی۔ وہ زمین پر لٹا کر اوپر اپنا پاؤں رکھ کر اپنے مسلک کے مطابق تکبیر پڑھ رہا تھا۔ عبدالوہاب نے اصرار کیا کہ میں خود مرغیاں حلال کروں گا۔ اور تم گوشت بنا دینا۔ دکان دار مان گیا۔ قریب بیکری سے اس نے راستے میں استعمال کے لئے کوک، مرنڈا اور چپس بسکٹ لیے۔ حالانکہ میں بھی یہ گھر سے ہی سامان لے کر چلا تھا۔ تاکہ راستے میں کھاتے پیتے انجوائے کرتے جائیں گے۔ مظفر آباد سے اب ہمارا پہلا پڑاؤ نیلم (وادی نیلم) تھا۔ اس دوران راستے میں جہاں جہاں خوب صورت مناظر، آبشاریں نظر آئیں۔ رک رک کر سلفیاں بنائیں اور تصاویر اور موویز بناتے چلے گئے۔ چلتی گاڑی سے اتنی گہری کھائیاں مجھے بار بار ڈراتی رہیں۔ دائیں بائیں آسمان سے باتیں کرتے پہاڑ اور ان پر چھوٹے بڑے سرسبز درخت دریا میں نیلا پانی کون کم بخت ہے جو ان نظاروں سے لطف اندوز نہ ہو۔ زندگی کا یہ یادگار سفر ہمیشہ یاد رہے گا۔

راستے میں وقفے وقفے سے سڑک پر بیشتر

بھیڑ بکریوں کے ریوڑ نظر آئے۔ یہ منظر بھی خوب منظر تھا۔ ان کے چرواہے اپنی مخصوص آواز اور سیٹی سے راستہ دینے کی درخواست کرتے اور وہ مان جاتے آتی جاتی گاڑیوں کو راستہ دے دیتے۔ پہاڑی پر گاڑی فراٹے بھرتی خطرناک موڑ کاٹتی پر نیلم کی جانب رواں تھی۔ ناگ کی طرح بل کھاتی یہ کچی پکی سڑکیں کسی ایڈونچر سے کم نہیں۔ کل رات سے چلے اب دوسرے دن کی شام ہونے کو آئی۔ جب ہم پانچ بجے کے قریب ساڑھے پانچ ہزار فٹ چڑھائی چڑھ کے پرتھم پہنچے اس دوران عبدالوہاب گہری نیند میری گود میں سویا رہا۔ منزل آنے پر اسے جگایا۔ وہاں دو ہزار روپے میں ہمیں ایک بڑا روم مل گیا۔ اس کا افتتاح تازہ تازہ ہی ہوا تھا۔ سارا ہی سامان نیا تھا۔ ہم نے ڈرائیور کے ساتھ اپنا سامان کمرے میں شفٹ کیا۔ چند منٹ آرام کیا۔ اور پھر کمرے سے باہر پہاڑی پر باربی کیو کا انتظام شروع ہوگیا۔ سردی شروع ہو چکی تھی۔

عبدالوہاب اور ذکاء الرحمن سلاخوں پر سے بے دردی سے بوٹیاں لگاتے رہے تیار ہوتے پر انہیں سب نوچ نوچ کر کھاتے رہے کتنا بے رحم اور گوشت خور ہے یہ انسان۔ اس دوران محمود اپنی زیادہ خوراک لینے سے آؤٹ ہوگیا۔ اسے زبردستی اٹھا کر وہاب باہر لایا تا کہ یہ بھی باربی کیو سے مزے لے سکے۔ وہ بے چارہ اپنے آپ میں نہیں تھا۔ زبردستی اس کے منہ میں اس نے ایک دو بوٹی ڈالی جب وہ نہ سنبھلا اور منہ میں بڑبڑاتا رہا۔ عاصم کمال اس کی مووی بناتا رہا۔ پھر اسے کمرے میں واپس چھوڑ آئے۔ سامنے دکان دار کو روٹیاں منگوانے کے لیے آرڈر دیا۔ یہاں فی روٹی 15 روپے میں ملتی ہے۔ سب نے سیر ہو کر مزے لے لے کر باربی کیو سے مزا اٹھایا پھر تھک ہار کر رات گیارہ کے قریب سو گئے۔ پھر کچھ آوارہ گردی کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ ان کے ناموں کی یہاں ضرورت نہیں۔

ان کی آوارہ گردی نے مجھے پریشان بھی کیا اور میرا موڈ آف ہوا۔ جمعہ کی صبح 16 ستمبر 2016ء اپر نیلم سے سب نے کپڑے تبدیل کئے اور ناشتہ انڈے اور پراٹھے اور چائے سے کیا۔ وہاں سے صبح نو بجے ڈرائیور نے گاڑی میں سامان رکھا۔ جو بیف اور چکن رات بچا تھا۔ وہ صبح ہوٹل والے کو کہا کہ اسے تل دے دوپہر یا شام کو کام آئے گا۔ اس کا حساب کتاب کیا اور گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔ اب ہماری اگلی منزل شاردہ تھی۔ یہ بھی کوئی چار پانچ گھنٹے کی مسافت بنتی ہے۔ راستے میں جہاں جہاں خوب صورت مناظر دیکھنے کو ملے وہاں رک کر اپنا کرتے سلفیاں بناتے رہے۔ حسین نظاروں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ کیوں کہ ایسے مواقع روز روز نہیں ملتے۔ اور نہ ہی یوں دوست اکٹھے ہوتے ہیں نہ جانے کل کون کس سے جدا ہو جائے۔ اور کسے بھول جائے۔ مجھے تو کم از کم اس بات کا یک دھڑکا ساری رہتا ہے۔

گاڑی میں گانوں اور غزلوں اور گیتوں پر خوب موج مستی کرتے رہے چلتی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ڈانس کرنا، ہاتھوں اور چھاتیوں کے تمام زاویوں کو حرکت دینا آسان کام نہیں۔ مگر یہ کام بے آسانی ملک ریاض اور عبدالوہاب سرانجام دے رہے تھے۔ جیسے ماضی میں کبھی یہ رقاص پارٹی کے پر گنا رہے ہوں۔ ہم تو صرف دیکھنے سننے اور محسوس کرنے والوں میں شامل تھے۔ جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کی نماز ادا کرنے کی فکر لاحق تھی۔ پتہ چلا کہ اس علاقے میں پونے دو بجے جمعہ کی نماز ہوتی ہے۔ ڈرائیور سے کہا کہ ہمیں شاردہ جمعہ کے ٹائم پہنچا دے۔ تا کہ نماز جمعہ ادا کی جا سکے۔ عین وقت پر شاردہ پہنچے۔ نماز جمعہ تیار تھیں۔ سامان گاڑی میں ہی رہنے دیا۔ ہم سب نے نماز جمعہ ادا کی۔ اس کے بعد کسی دکان دار سے فون لے کر میں نے اور ملک ریاض نے اپنے اپنے گھر فون پر رابطہ کیا۔ کیوں کہ یہاں ہماری سم نہیں کام کرتی۔ نہ ہی کوئی ( ) ۲ ملا۔ سم کی کوشش کی وہ بھی نہ ملی۔ اپنے بیٹے فیاض سے بات ہوئی اور کہا کہ ہمیں بار بار فون نہیں کرسکوں گا۔ کیوں کہ یہاں سگنل نہیں آتے۔ سب دوست ہوٹل والے کے پاس آئے ایک ہزار روپے میں کمرہ کرایہ پر لیا۔ یہ کمرہ کوئی خاص کمرہ نہیں تھا۔ بس مجبوری تھی یہاں رات گزار کر کل آگے جانا تھا۔ سامنے بہتا دریا تھا اور ہوٹل میں پانی کی کمی تھی۔ دوپہر کا کھانا کھایا اور باہر ریسٹورنٹ کے سامنے کوئی نیلی پیڈ جا سے اس پر کرسیاں بچھی تھیں ان پر بیٹھ کر چاروں اطراف کھڑے پہاڑوں اور خوب صورت رنگ برنگے رنگوں کے گھروں کا نظارہ کرتے رہے۔ یہاں بھی سب تصاویر لئے رسلفیاں بناتے رہے۔ اس پکنگ پوائنٹ کے قریب ہی ایک تاریخی جگہ شاردہ یونیورسٹی ہے۔ جو چند کنال پر پرانے سے پتھروں پر محیط ہے۔ جو ویرانے کا سا پیش کرتی ہے۔ اس کی مرمت اور دیکھ بھال کا کوئی خاص انتظام نہیں۔

یہ یونیورسٹی سطح زمین سے کوئی ساٹھ فٹ اونچائی پر ہے اس کی سیڑھیاں بڑے بڑے پتھروں سے بنی ہیں۔ اس یونیورسٹی کے درمیان میں ایک اجاڑ ویران مندر کھڑا ہے لوگ بتاتے ہیں کہ شاہدرہ ایک ہندو لڑکی تھی۔ ایک جن کو اس سے پیار ہوگیا۔ اور اس نے یہ چار دیواری ایک رات میں بنائی تھی۔ اس کی تفصیل بھی ہے یہاں کوڈ کرنا مناسب نہیں۔ وہاں سے واپس آئے تو شام کے سائے پھیلنے لگے۔ سورج پہاڑوں کی گود میں سر رکھ کر سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے بعد دوستوں نے ہلہ گلہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ ہوٹل کے باہر مختلف ٹولیوں میں سیاح گپوں میں مصروف تھے۔ کوئی کھانا کھا رہا تھا اور کوئی چائے کے مزے لے رہا تھا۔ ہیلی پیڈ کے قریب گاڑی کھڑی کی اور اس میں اپنی پسند کی اونچی آواز میں گانے لگائے اس پر ملک ریاض، عبدالوہاب اور عاصم کمال نے خوب کمال کا ڈانس کیا۔ وہاں موجود لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ قریب بیٹھے مانسہرہ کے لڑکے بھی ڈانس میں شامل ہوگئے۔ اب انہوں نے پشتو گانے لگائے۔ جس پہ ان لڑکوں نے پشتو رقص کیا۔

سردی بڑھ گئی تھی۔ میں نے اپنی جیکٹ اتار کر عبدالوہاب کو پہنائی اور خود ہوٹل والوں کا کمبل لے کر باہر آ کر ان کا ڈانس دیکھنے لگا۔ عبدالوہاب کے دوست ذکاء الرحمٰن نے کسی چیز کی خواہش ظاہر کی۔ جسے پورا کرنا مشکل تھا۔ یہ سارا فوجی ایریا ہے۔ اس کے بے جا اصرار پر انہیں اس کی ایک ضد پورا کرنا پڑی۔ مگر اس کا موڈ پھر بھی ٹھیک نہ ہوا۔ اس کے مسلسل ماحول خراب کرنے سے محمود احمد اور ارژنگ عبدالوہاب سخت پریشان تھے اور ہم سے شرمندہ بھی۔ اس کے رویے کی وجہ سے بار بار ہم سے معذرت کرتے رہے۔

رات کا کھانا کھانے لگے میں اس وقت لیٹ چکا تھا۔ کچھ میرا موڈ بھی آف تھا۔ عبدالوہاب نے کھانے کا کہا تو میں نے جواب دے دیا۔ اس پر یہ اور پریشان ہوا پہلے ہی اس کے دوست نے اس کے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ مجھے ایک دوست نے اشارہ کیا کہ یہ کیا ہے میں نے فوراً اس کے ساتھ کھانا شروع کیا اور اس سے پہلے اس کے آنسو اپنے گناہگار ہاتھوں سے صاف کیے۔ پر میرے آنسو صاف کرنے سے قبل کچھ آنسوؤں نے پلکوں سے گر کر خودکشی کرلی۔ دریاؤں، جھرنوں ندی نالوں کی اس زمین پر ایک ندی نے جنم لیا۔ اس ندی کو خشک کرتے کرتے میں خود رو پڑا۔ اب میرے آنسو اس ندی میں مل کر ایک طوفان برپا کر رہے تھے۔ اس طوفان کی آواز سننے والا کوئی نہ تھا۔ اگر ہمارے علاوہ کوئی اور نہ ہوتا تو خدا کی قسم میں آنسو بھی زمین پر گرنے نہ دیتا۔ بلکہ شبنم کے ان نمکین موتیوں کو..........!

وقت خوش خوش کاٹنے کا مشورہ دیتے ہوئے
رو پڑا وہ خود کو حوصلہ دیتے ہوئے

یہ میری فطرت میں شامل ہے۔ کہ میں اپنی دوستی میں کچھ دوسرے دوست کی آمیزش قبول نہیں کرتا۔ میں تو یہی کہوں گا اپنے دوست سے۔

وہ مہربان ہے تو اقرار کیوں نہیں کرتا
وہ بدگمان ہے تو سو بار آزمائے مجھے

میں جانتا ہوں کہ سفرناموں میں اشعار کا استعمال نہیں ہوتا۔ لیکن کیا کروں اپنی کم علمی یا دلی کیفیت کو دوسرے تک پہنچانے کے لیے ان کا سہارا لینا پڑا۔ رات کا کھانا کھا کر میں تو تھکا ہارا تھا سو گیا۔ ایک دو دوست جو دیر سے سونے کے عادی ہیں۔ پھر کمرے سے باہر نکل گئے۔ یہاں رات کا منظر بھی خوب ہوتا ہے۔ رات کی دیوی پہاڑوں سے گلے مل رہی تھی قریب کھڑا چاند رشک بھری آنکھوں سے یہ تماشا ہوتا دیکھ رہا تھا۔ ہمارے یہ دونوں دوست بھی دل جلے محبت کے مارے ہوئے ہیں۔ ان کے سینوں میں دفن بے شمار عشق و محبت کی داستانیں محفوظ ہیں۔ جو ان کا سرمایہ حیات ہیں کیونکہ یادیں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ رات گزری صبح کی کرنیں دروازے کی درازوں سے اندر داخل ہو رہی تھیں۔ سب سے پہلے حسب معمول ساڑھے 6 بجے میں اٹھ بیٹھا۔ واش روم سے فارغ ہو کر برش کیا اور برآمدے میں کھڑے ہو کر شیو بنائی اور منہ ہاتھ دھویا۔ پانی یخ ٹھنڈا تھا۔ کپڑے تبدیل کیے اور باری باری سب کو جگانا شروع کیا۔ ہفتہ 17 ستمبر 2016 صبح نو بجے کے قریب ہم نے ناشتہ کیا۔ اور شاہدرہ کو خیرباد کہہ کر گاڑی میں سوار ہوئے۔ پہاڑوں کا یہ سلسلہ ہمارے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اب ہماری اگلی اور آخری منزل اڑنگ کیل تھی۔ یہ بھی کوئی پانچ چھ گھنٹے کا راستہ ہے۔ وہی خطرناک موڑ سنگل سڑک گہری ندیا، نیلا پانی، دائیں بائیں آگے پیچھے سبز لباس پہنے پہاڑ ہمیں خوش آمدید کہہ رہے تھے راستے میں ایک جگہ رک کر سلفیاں اور کیمرے سے تصویریں بنائیں۔ بالآخر ہم دو بجے کے قریب

ارژنگ کیل کے تفریحی مقام پر پہنچے۔ وہاں سے سیچ زمین یعنی پل تک جانے کے لیے جیپ میں 650 روپے دے کر سوار ہوئے اس نے سات سو مانگے تھے۔ جیپ والے خشک دماغ آدمی نے 50 روپے کم کے بدلے ہمیں پل سے بہت پہلے ہی اتار دیا۔ ہم سب دوستوں کو یہ پتھریلا راستہ پیدل طے کرنا پڑا۔ اس پل کی تعمیر 1982ء میں ہوئی ایک بریگیڈیئر نے اس کا افتتاح کیا تھا۔ پہاڑ کی اونچائی 7030 فٹ اور فاصلہ 300 فٹ ہے پل کی شروع اور آخر میں انٹری کے لیے فوجی جوان بیٹھے ہیں۔ یہ کام با آسانی محمود انجام دیتا رہا۔ یا پھر ڈرائیور راستے میں جہاں جہاں چیک پوسٹیں تھیں۔ انٹری کرواتا رہا۔ جہاں پولیس کی چیکنگ تھی وہاں میں اپنا کارڈ دکھا کر راستہ لیتا رہا۔ اس سے دوستوں میں ہماری بھی عزت رہ گئی۔ ورنہ لوگ تو عزت کی تلاش میں...... اب ہمیں دو گھنٹے کا تکلیف دہ سفر پہاڑی پر چڑھنے کا طے کرنا تھا۔ سب ہی برابر چڑھنا شروع ہوئے۔ اوپر جانے کے لیے ایک سوٹی کا سہارا بھی لینا پڑتا ہے۔ تاکہ انسان کا توازن برقرار رہے۔ میں نے بھی سوٹی کا سہارا لیا۔ لیکن میرے دوست عبدالوہاب نے ایسا نہیں کیا میں اور وہاب سب سے آگے تھے۔ باقی ٹیم پیچھے رہ گئی۔ پہلے پہل تو تازہ دم تھے مرحلے طے کرتے رہے۔ درمیان میں آ کر بس ہو گئی۔ بار بار سانس پھول رہا تھا۔ دل کی دھڑکن تیز تھی۔ اس کی آواز تھی جو سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ایک خچر والے سے بات کی کہ ہمیں اوپر پہنچا دے اس نے فی آدمی پانچ سو روپے مانگے۔ ہم نے کم کہے وہ نہ مانا تو اس لیے پیدل ہی سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ کچھ پگڈنڈیوں سے چڑھتے سانس لیتے اور درختوں سے باتیں کرتے اپنی منزل تک پہنچ گئے۔ ہمارا یہ سفر صرف ڈیڑھ گھنٹے کا تھا ایک بجے کولڈ ڈرنک والی دکان کے سامنے بیٹھ گئے۔ کولڈ ڈرنک پی اور اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے ہمیں اپنی منزل تک پہنچایا۔ باقی دوست کوئی پون گھنٹہ بعد اوپر پہنچے۔ ارژنگ کیل کا منظر دیکھ کر ساری تھکاوٹ دور ہو گئی۔ محمد بشیر سے ایک کمرہ ایک ہزار روپے میں کرایہ پر لیا۔ اپنا سامان وہاں رکھا۔ کچھ دیر آرام کیا۔ یہ پہلی منزل پر لکڑی کا بنا ہوا۔ نیا گھر تھا۔ پھر باہر نکل آئے شام سے پہلے پہلے دن کے اجالے میں تصاویر بنائیں۔ ملک ریاض اور عاصم کمال نے گھوڑے پر سوار ہو کر سوری ہوائی۔ شام کے لیے ہوٹل والے کو 1200 روپے میں چکن کڑاہی بنانے کا آرڈر دیا۔ اس دوران ہوٹل والے کے موبائل سے گھر رابطہ کیا تو ایک بری خبر کا سامنا کرنا پڑا۔ بیٹے فیاض نے بتایا کہ پاپا انکل امجد علی کل رات انتقال کر گئے ہیں۔ آج صبح 10 بجے تدفین ہو گئی ہے اور کل رسم قل ادا کیے جائیں گے۔ اس دردناک خبر سے میرے پیروں تلے سے زمین سرکتی محسوس ہوئی۔ سکتہ سا طاری ہو گیا۔ آنکھیں نم ہو گئیں اور میں ماضی کی بھول بھلیوں میں گم ہو گیا۔ امجد نے میرے برے وقت میں ساتھ دیا تھا۔ جب میرا سایہ بھی میرا ساتھ چھوڑ گیا ہے۔ پاس کھڑے دوستوں نے بھی میرے ساتھ افسوس کیا۔ چند منٹ پہلے اس پہاڑ کی خوب صورتوں کے مناظر ہیں جہاں میں محو تھا۔ اب وہ نظارے مجھے پھیکے پھیکے لگنے لگے۔

کھڑے درختوں کو زار و قطار دیکھتے ہیں
بچھڑنے والے ہمیں بار بار دیکھتے ہیں

اسی طرح ہمارے ساتھ ٹور پر جانے والے عاصم کمال کو نوکری سے نکالے جانے کی دھمکی آمیز کال موصول ہوئی۔ جس سے وہ اداس ہو گیا۔ ناصر کاظمی کی طرح گہری سوچوں میں گم یہ سوچ رہا تھا۔

دل تو میرا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

ہمارے اس دورے کے درمیان میرے دوست عبدالوہاب نے میرا خیال رکھا اور کبھی غفلت کا شکار بھی ہوا۔ یہ اور میرے لیے ناگوار گزرا۔ جس کا میں نے اسے ذکر بھی کیا۔ اس ٹور کے دو ہیرو ٹھہرے جن پر اس کی خاص توجہ رہی۔ یہ عجیب آدمی ہے ساتھ چھوڑتا بھی نہیں اور پاس بیٹھتا بھی نہیں۔ اس کی بے رخی کے نام یہ شعر پیش ہے۔

اک کھلونا ٹوٹ جائے گا نیا مل جائے گا
میں نہیں تو کوئی تجھ کو دوسرا مل جائے گا

رات کا کھانا کمرے میں ہی منگوا لیا۔ کھانے سے پہلے ملک ریاض نے کمرے میں خوب موج مستی کی۔ چکن کڑاہی اچھی مزے دار بنی تھی۔ گرم گرم روٹیاں اور گائے کے دودھ کی گاڑھی چائے بڑا لطف دے رہی تھی۔ صبح واپس کے لیے پہاڑی سے اترنے کا فکر بھی دماغ پر سوار تھا۔ سونے کی کوشش کی مگر نیند نہ آئی۔ میں ذکاء الرحمٰن، محمود، عاصم کمرے میں رہے۔ ملک ریاض اور وہاب باہر نکل کر کسی چوپال میں جا بیٹھے۔ رات ایک بجے کے قریب واپس آئے میں ابھی جاگ رہا تھا۔ آخر کار مجھے نیند کی گولی کا سہارا لینا پڑا۔ تاکہ نیند پوری ہو اور تھکان

دور ہو۔ نہ جانے کب آنکھ لگی پھر صبح چھ بجے اٹھ بیٹھا۔ نیچے جا کر پانی نہ آنے کی شکایت کی۔ پھر جا کر پانی آیا۔ برآمدے میں کھڑے ہو کر شیو بنائی۔ برش کیا اور ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔ خود تیار ہو کر باقی دوستوں کو جگایا کہ اب پانی آ رہا ہے۔ تیار ہو جاؤ۔ سب تیار ہو کر اپنا اپنا سامان اٹھائے کچن سے باہر ناشتے کے لیے بیٹھ گئے۔ سب نے کھلے میدان میں ہوٹل کی کچن کے پاس بیٹھ کر صرف چائے اور بسکٹ کا ناشتہ کیا۔ اپنا اپنا بیگ اٹھایا اور ان حسین وادیوں کو خدا حافظ کیا اور نیچے اترنے لگے اب سب سے آگے محمود درمیان میں، میں تھا اور پھر میرے پیچھے (اے ڈبلیو) انہوں نے کہا کہ اب واپسی کا سفر ڈرامائیڈ و پُرتجسس کا ہونا چاہیے۔ انہوں نے پگڈنڈیوں کا راستہ چھوڑ کر سیدھے خطرناک طریقے سے اترنے کا پروگرام بنایا، یہ راستہ شارٹ کٹ رہے گا۔ جلدی نیچے سطح زمین پر پہنچ جائیں گے۔ ایک ڈر ساتھ چلا گیا اور دوسرا حوصلہ بڑھاتا چلا گیا۔ رات کی اوس کی وجہ سے پھسلن تھی۔ ہم نے سات سوا سات بجے نیچے اترنا شروع کیا تھا۔ ہمیں پہاڑ سے نیچے جاتی ہوئی ایک مضبوط پلاسٹک کیبل مل گئی۔ جس کا سہارا لیے ہم اس خطرناک وادی سے نیچے آ رہے تھے۔ دل میں ایک انجانا سا خوف بھی تھا۔ باری باری ایک ایک بار ہم پھسل بھی گئے پر کیبل کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ورنہ.........

خیر اللہ اللہ کر کے ہم صرف 35 منٹ میں سطح زمین پر آ گئے۔ ہمارے ساتھی پہلے کی طرح پھر پیچھے رہ گئے۔ ہم نے پل کراس کیا۔ اور پھر اوپر چڑھنا پڑا یہ پتھریلا راستہ ہے۔ تھکا دینے والا کچھ دیر بعد ہم اپنی گاڑی کے پاس پہنچ گئے۔ یہ اتوار 18 ستمبر 2016 کا دن ہے اب ہماری منزل واپسی کی تھی۔

صبح کے دس بجے تھے۔ جب ہم اڑنگ کیل سے روانہ ہوئے۔ ہمیں وہی راستوں سے واپس گزرنا تھا۔ جہاں سے ہم یہاں پہلے تھے۔ شاردہ آیا رتی گلی کا موڑ آیا ڈرائیور نے کہا کہ ہم مری سے ہوتے ہوئے جی ٹی روڈ سے ہی لاہور جائیں گے کیوں کہ موٹر وے پر مجھے نیند آ جاتی ہے یہ ڈرائیور بھی ایک عجوبہ تھا۔ ہم تو عجیب تھے ہی یہ ہم سے بڑا عجیب تھا۔ یوں کہہ لیں گاڑی اچھی تھی ڈرائیور ماٹھا تھا۔

خیر..... راستے میں گاڑی میں گانوں، غزلوں اور ہجروں کے گیتوں کا پروگرام چلتا رہا۔ کبھی بے وقتی اذان سنائی جاتی جیسے ہم نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں۔ اور انسان کے جذبات کو بھڑکانے والے گیت سنائی دیتے۔ یہ سارا کام ملک ریاض انجام دے رہے تھے۔ یہ رنگ باز آدمی ہے۔ نعت سنتا تو بن بادل برسات کی طرح آنسو بہاتا گانے چلتے تو گانے کے مختلف ٹیپ سے دوسروں کے دل کھاتا۔

تین بجے کے قریب ایک ہوٹل کے پاس رکے۔ وہاں سے دوپہر کا کھانا کھایا گرم گرم روٹی مٹن، بریانی اور کولڈ ڈرنک سے لطف اندوز ہوئے وہاں سے چلے تو شام کے وقت مظفرآباد بازار میں رک گئے۔ وہاں سے (اے ڈبلیو) نے کین، جوس، چپس اور بسکٹ لیے۔ اس طرح کھاتے پیتے گپیں ہانکتے چلے جا رہے تھے۔ گاڑی فراٹے بھرتی اپنی راہوں کی جانب رواں دواں تھی۔ میرے سر پر سوار صبح کی ڈیوٹی تھی کہ میں رات کو کب وقت پر پہنچ پاؤں گا۔ آرام کیسے کروں گا۔ آفس ڈیوٹی پر پہنچنا بھی ضروری ہے۔

رات کا وقت تھا سڑک کے کنارے کھڑے پیڑ چپ کی چادر اوڑھے سو رہے تھے۔ کیا کسی نے خوب کہا ہے۔

تو نے دیکھا ہے کبھی ایک نظر شام کے بعد
کتنے چپ چاپ سے لگتے ہیں شجر شام کے بعد

ہمیں شکریہ ادا کرنا ہے رانا وقار علی کا جنہوں نے عبدالوہاب کی جگہ پر ڈبل ڈیوٹی کی اور ہم اس سفر سے مزے اٹھا سکے اور اس نے اپنے والد گرامی سے اسے اجازت دلائی۔

رات دس بجے کے قریب ہم راولپنڈی پہنچے ذکاء الرحمٰن کو وہاں اڈے پر اتارا۔ اس نے کسی سے ملاقات کر کے واپس فیصل آباد جانا تھا۔ رات کا یہ تھکا دینے والا سفر بھی ہمیشہ یاد رہے گا۔ گجرات کے قریب رات دو بجے ایک ہوٹل پر گاڑی رکوا کر ڈرائیور کو چائے پلائی۔ پتہ چلا کہ اسے نیند آ رہی تھی۔ یہ دوستوں نے اچھا فیصلہ کیا۔ ورنہ.........

صبح کے چار بجے بروز پیر 19 ستمبر 2016ء کو گاڑی نے ہمیں گھر پر اتارا۔ اللہ کا شکر ادا کیا۔ کہ سارا سفر خیریت سے گزر گیا۔ نیند سے برا حال ڈیوٹی پر جانے کا فکر جسم تھکا چور، اداس چہرہ ویران آنکھیں یہ کہہ رہی تھی۔

غم زندگی تیرا شکریہ
میں کہاں کہاں سے گزر گیا

خدا حافظ دوستو! پھر ملیں گے......

سفرنامہ چین

سعدیہ بتول/راولپنڈی

اکتوبر 2013 میں ہم تھائی ایئر ویز کے ذریعے چین کے شہر شنزن پہنچے۔ یہ ہانگ کانگ کے بارڈر سے ملحق صرف چالیس سال تاریخ رکھنے والا ایک نوجوان شہر ہے۔ 1979ء سے قبل ساحلی علاقہ ہونے کے باعث یہاں صرف مچھیرے رہتے تھے جبکہ اب صورت حال یکسر مختلف ہے اب یہ ایک نیا آباد شدہ جدید شہر ہے جس میں عمارتوں کی سکائی لائن نمایاں ہے۔ یہ شہر سمندر کی نیلاہٹوں میں گھلا اور سرسبز پہاڑی چوٹیوں سے مزین ہے۔ دامے شا ساحل کے کنارے بسنے کی وجہ سے گرم اور نمی والا موسم رکھتا ہے یہاں بارشیں بھی بہت ہوتی ہیں۔ گوانگ ڈانگ صوبے کے اس شہر کی آبادی قریباً دس ملین ہے جن میں جوان لوگ زیادہ ہیں۔ اگر اسے جوانوں کا شہر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا بوڑھے لوگ بھی نظر آتے ہیں لیکن ان کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ کو بے پناہ قدرتی خوبیوں سے نوازا ہے جس میں انسان کی مداخلت نے اس کے حسن کو دو آتشہ کر دیا ہے۔ لوگ زیادہ تر چینی زبان بولتے ہیں البتہ پڑھا لکھا نوجوان طبقہ انگریزی بول اور سمجھ لیتا ہے غیر ملکیوں کیلئے یہ لوگ غنیمت ہیں ورنہ بہت سی جگہوں پر تو محض اشاروں سے کام چلانا پڑتا ہے جو اکثر غلط ثابت ہوتے ہیں اور مزاح کا باعث بنتے ہیں۔ ہم عموماً اس مشکل سے نپٹنے کیلئے موبائل میں محفوظ کردہ مترجم ایپ سے مدد لیتے تھے۔ شنزن کو چین کی معیشت کا دروازہ کہا جاسکتا ہے کیونکہ یہ ایجادات اور برقی آلات کا مرکز ہے۔ یہاں کی (seg market) الیکٹرانک کیلئے دنیا بھر میں مشہور ہے یہ ایک اہم تجارتی مرکز ہے جہاں موبائل، لیپ ٹاپ وغیرہ کے علاوہ بھی ہر قسم کی چیز بآسانی دستیاب ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ الیکٹرانک کے ہر معروف برانڈ کی بہترین نقل بھی یہاں سستے داموں مل جاتی ہے۔ چونکہ ان لوگوں میں عقل فراواں ہے لہٰذا نقل بھی اس عمدگی سے تیار کرتے ہیں کہ اصل کا گماں ہوتا ہے۔ ہم نے Minzhe میں ایک فلیٹ کرائے پر لے رکھا تھا۔ جہاں ہم نے تقریباً دو ماہ گزارے جبکہ آخری ماہ خواجن ہے میں بسر کیا۔ minzhe میں ہمارے سامنے والے فلیٹ میں ایک چینی لڑکی سوسن رہتی تھی وہ چار سال فرانس میں پڑھ کر آئی تھی لہٰذا انگریزی بآسانی بول اور سمجھ لیتی تھی۔ اس سے روز رات کو ایک ڈیڑھ گھنٹہ گپ شپ ہوتی۔ اگر کبھی دوران گفتگو کوئی لفظ مسئلہ بھی بنتا تو صرف لہجے کے فرق کی بناء پر۔ اسے گھر گھر گھومنے کا بہت شوق تھا۔ ایک روز مجھے کہنے لگی کہ میں بھی جانا چاہتی ہوں۔ یہ ایک خوبصورت ملک ہے۔ میں نے بہت سر پٹکا بار بار اس سے یہ لفظ بلوایا لیکن سمجھ میں نہ آسکا کہ آخر دنیا کے نقشے پر یہ کونسا نیا ملک نمودار ہوا ہے جس سے میں بے خبر ہوں اور وہ حیران تھی کہ میں اتنے معروف اسلامی ملک سے ناواقف ہوں۔ بالآخر اس نے ایک کارڈ پر لکھا ہوا دکھایا تو میں سمجھی کہ وہ ترکی کو ٹرکی بول رہی ہے۔ وہ تمام دن نوکری کے سلسلے میں گھر سے باہر ہوتی شام میں اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولے لیپ ٹاپ پر محویت سے ٹینس کے میچ دیکھتی نظر آتی۔ چھٹی کے روز خود بھی پریکٹس کرنے جاتی اور اکثر مجھے بھی ساتھ لے جاتی۔ اس نے بتایا کہ چین میں زمین کافی مہنگی ہے اس لیے زیادہ تر لوگ چھوٹے چھوٹے فلیٹوں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کو ماں باپ کے ساتھ ہی رہنا پڑتا ہے لہٰذا گھروں میں ساس بہو کے جھگڑے بھی ہوتے ہیں۔ ان کی ایک عجیب عادت یہ ہے کہ جوتے گھر میں نہیں لے جاتے بلکہ ہر فلیٹ کے باہر ایک ریک رکھا نظر آیا جس پر جوتے اتار کر یہ لوگ گھر میں داخل ہوتے اور واپس آنے پر جوتوں کو حیرت انگیز طور پر وہیں پاتے۔ چینی لوگ اپنی زبان کے علاوہ ایک نام انگریزی کا بھی رکھتے ہیں کیونکہ لہجے کے فرق کی بناء پر دیگر ممالک کے لوگ ان کے نام بول نہیں پاتے۔ جیسا کہ دنیا ٹرانسپورٹ اور مواصلات کی ترقی کے باعث ایک گاؤں یعنی (Global Village) کی صورت اختیار کر چکی ہے اور بین الاقوامی تعلقات ناگزیر ہیں اس لیے ان کے سکولوں میں اب انگریزی زبان لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ شامیں تو بہت سے ممالک کی مشہور ہیں لیکن چین میں علی الصبح کا وقت جتنا خوبصورت اور دلکش ہوتا ہے شاید ہی کسی دوسرے ملک میں ہوتا ہو۔ طلوع آفتاب کے وقت یوں گمان ہوتا جیسے تمام لوگ گھر سے باہر نکل آئے ہوں۔ ہر طرف ایک خوشگواری ہلچل کا احساس پھیلا ہوتا۔ ہر عمر اور ہر طبقے کا فرد چہل قدمی، جوگنگ، یوگا اور دیگر ورزشیں کرتا نظر آتا۔ عورت مرد کی تخصیص نہ تھی اور بوڑھے جوانوں کے مقابل زیادہ سرگرم معلوم

ہوتے۔پارکوں میں واک کرنے کیلئے خوبصورت ٹریک بنے ہوئے ہیں۔بعض لوگ اس دوران کانوں میں ہیڈفون لگائے ہوتے جبکہ پارکوں میں بلند آواز میں بھی موسیقی کا انتظام ہوتا تھا جس کی لے پر تمام لوگ یکساں تھرکتے۔اس دوران یہ سب اپنے گردو پیش سے یکسر بے نیاز ہوتے۔انہیں اس بات سے قطعاً غرض نہ ہوتی تھی کہ ہم کیسے لگ رہے ہیں یا کوئی ہمارے بارے میں کیا سوچ رہا ہے؟ ہر کوئی اپنی دھن میں مگن رقص نما ورزش کرتا نظر آتا تھا۔تفریح گاہوں اور پارکوں میں ورزش کیلئے مشینیں بھی نصب تھیں علاوہ ازیں کھلی فضا میں پہلوانوں کیلئے جم کے ساتھ ساتھ مالش اور چاپی کی سہولت بھی موجود تھی۔

شنوہن صاف ستھرا، سرسبز اور خوبصورت ہے۔اتنے بڑے شہر میں ڈھونڈنے سے گندگی، توڑ پھوڑ اور بکھراوا نہیں ملتا۔باغ باغیچوں کی بہتات ہے جن کا خیال رکھنے والا عملہ مستعد اور تربیت یافتہ ہے۔جا بہ جا بائکنگ اور جاگنگ کیلئے ٹریک بنے ہوئے ہیں۔سڑکیں کشادہ ہیں جن کی دونوں اطراف میں ایک سرخ ٹریک سائیکل سواروں کیلئے اور ساتھ ہی ایک سیمنٹ کا ٹریک پیدل چلنے والوں کیلئے بنا ہوتا ہے۔ان دونوں راستوں کے درمیان ایک ترتیب سے جڑے ہوئے درختوں کی قطار ہوتی ہے جو تناسب کٹائی کے باعث خوبصورتی اور سایہ داری دونوں کام بیک وقت انجام دیتی ہے۔ہر تھوڑے فاصلے پر براؤن رنگ کے کوڑادان جن کے ڈھکن پر ایش ٹرے بنی ہوتی ہے نصب ہیں۔ان کی صفائی اور شاپر کی تبدیلی باقاعدگی سے روزانہ کی جاتی ہے۔ ٹریفک چونکہ تیز رفتار ہے لہٰذا سڑک پار کرنے کیلئے زیبرا کراسنگ بنائے گئے ہیں جبکہ بعض جگہ پل کے ذریعے سڑک پار کی جاتی ہے۔سڑکوں، عمارتوں اور دیگر اہم مقامات پر حفاظتی کیمرے نصب ہیں جو شہریوں کو تحفظ فراہم کرتے ہیں۔کوکو پارک، گم ہاؤ، تمن، خواچن، ہے اور لوہو خریداری کیلئے بہترین جگہیں ہیں جہاں مول تول کر کے آدھی قیمت پر چیز خریدنا ممکن ہے۔یہاں جوتے، بیگز، آرٹیفیشل جیولری، گھڑیاں اور دیگر دلچسپی کی اشیاء موجود ہیں۔یہاں کا پیسہ یوآن کہلاتا ہے جسے عرف عام میں rmb کہتے ہیں۔ہم نے بھاؤ تاؤ کیلئے سوہن سے چائنیز گنتی اور چند جملے سیکھے مثلاً تو شو چن؟ (یہ کتنے کا ہے؟) پیائے تن (قیمت کم کرو) اور شے شے (شکریہ)۔یہ چنی آنکھوں اور چپٹی ناک والے لوگ ہمارے منہ سے اپنی زبان کے الفاظ سن کر خاصے حیران ہوتے ہمارے ملک کی زبانوں میں پشتو زبان کا لہجہ چائنیز سے قریب تر ہے۔یہاں مقامی برانڈز کے علاوہ ہر بین الاقوامی برانڈ کی نقل بھی موجود ہے جسے پرکھنے میں اچھے خاصے تجربہ کار بھی دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ بڑے شاپنگ مالز میں ہر برانڈ کی اصل دکانیں بھی موجود ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ان میں اشیاء کی قیمتیں بھی اصلی ہیں جو آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔لہٰذا کم خرچ ہے بالا نشیں یعنی اگر ایک کی قیمت میں زیادہ چیزیں آ جائیں تو کیا مضائقہ ہے؟ چینیوں میں کتب بینی کا ذوق بھی بہت ہے۔شہر میں کئی لائبریریاں موجود ہیں جہاں ہر موضوع پر کتابیں مل جاتی ہیں۔چائنیز کے علاوہ انگریزی کتب کا کارنر بھی ہوتا ہے۔لوگ دارالمطالعہ کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہجوم کے باوجود سکوت چھایا ہوتا ہے۔چھوٹے بچے بھی اس قدر خاموشی اور انہماک سے مطالعہ کررہے ہوتے ہیں کہ ان کی تربیت پر رشک آتا ہے۔الیکٹرانک کی دنیا میں انقلاب برپا کرنے کے باوجود اس قوم نے کتاب سے تعلق نہیں توڑا بلکہ اسے مزید ترقی دی ہے۔ ریلوے اسٹیشنوں اور دیگر انتظار گاہوں میں لوگ وقت کا زیاں کرنے کے بجائے میگزین اور رسائل پڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔وقت کی اہمیت کے اس قدر قائل ہیں کہ ملک میں یوٹیوب اور فیس بک جیسی سائٹس بین ہیں ان تک پہنچنے کے چور راستے البتہ موجود ہیں۔خواچن ہے میں ہوالیان بلڈنگز میں ہمارا قیام چوبیسویں منزل کے چوبیسویں فلیٹ میں تھا اس کے ٹیرس سے سڑک پر چلنے والی گاڑیاں چھوٹی ڈبیوں کی مانند نظر آتی تھیں۔نیچے اترو تو سامنے ایک سرسبز پارک تھا جہاں میں اکثر شام کو چہل قدمی کیلئے جایا کرتی تھی۔پارک میں اکثریت بوڑھوں اور چھوٹے بچوں کی ہوتی تھی جوان طبقہ چونکہ فکر معاش میں مصروف ہوتا ہے لہٰذا چھوٹے بچے دادا دادی یا نانا نانی کی زیر نگرانی کھیلتے پائے جاتے ہیں۔چینی بچوں کو زیادہ تر سائیکلیں اور اسکوٹیاں دوڑاتے دیکھا جبکہ بڑے لڑکے لڑکیاں پاؤں میں پہیوں والے جوتے کے مہارت سے پھسل رہے ہوتے۔تین سال سے کم عمر بچوں کو ربڑ کے ایک ٹب نما حوض جسے ہوا بھر کر پھلایا گیا ہوتا اس میں نرم سے بیچ بھر کر چھوڑ دیا جاتا اور کھیلنے کیلئے ہاتھوں میں مختلف چھوٹے بڑے ڈبے اور بیلچے تھما دیے جاتے۔بچے آپس میں ہنستے کھیلتے اور بوڑھے قریبی بنچوں پر اپنے ہمجولیوں کے ساتھ وقت گزارتے۔پرانی نسل چونکہ صرف چینی زبان تک

محدود ہے اس لیے ان کے ساتھ صرف مسکراہٹ کا تبادلہ اور ہاتھ ہلانے تک ہی تعلق رکھنا ممکن تھا۔ بڑھاپے میں یوں بھی مرد و عورت کا فرق کم ہو جاتا ہے لیکن چینی بوڑھوں میں تو بالکل ہی معدوم ہو جاتا ہے۔ کانوں تک ایک سے کٹے بال اور ایک سے پرنٹ کے کھلے آرام دہ پاجامہ قمیض پہنے گھوم رہے ہوتے ہیں۔ چینی لوگوں کے لباس کا ذوق یوں بھی ہم سے خاصا مختلف ہے۔ ہر رنگ اور انوکھی میچنگ کے کپڑے پہنتے ہیں ان کا روایتی لباس چونکہ عہد حاضر سے مطابقت نہیں رکھتا لہٰذا وہ لوگ عموماً نیکر یا پینٹ کے ساتھ مختلف شرٹس پہنتے ہیں۔ یہاں بیوٹی پارلر اور سیلون بھی کافی ہیں۔ چائنیز لوگ میک اپ کا استعمال کم کرتے ہیں البتہ جلد کو شفاف اور چمکدار بنانے کیلئے ضرور اہتمام کرتے ہیں، ہیئر اسٹائل بنانے میں بھی خاصی مہارت رکھتے ہیں۔ نئی نسل بالی ووڈ کی تقلید کرنے میں فخر محسوس کرتی ہے۔ سن گلاسز کا فیشن تو ہر جگہ ہے لیکن چین میں ہم نے لڑکیوں کو بطور فیشن خالی فریم بھی آنکھوں پر سجائے دیکھا۔ مختلف رنگوں اور نمونوں سے مزین بغیر شیشوں کے فریم ناک پر اٹکانا ہمارے لئے ایک نرالا انداز تھا۔ خواجن بے میں siebo کے نام سے سپر سٹور ہے جس میں ہر قسم کی کھانے پینے اور گھریلو استعمال کی اشیاء دستیاب ہیں۔ صرف دس منٹ کی واک پر ٹرین اسٹیشن ہے ساتھ ہی ایک بڑا شاپنگ مال jesco ہے۔ یہاں دکاندار زیادہ تر عورتیں ہوتی ہیں۔ یوں بھی ملک میں عورت مرد کی تفریق بالکل نہیں ہے ہر کام میں دونوں شانہ بشانہ کام کرتے دکھائی دیئے۔ ہمیں عورتوں کو بھرپور اعتماد سے ٹرک اور سائیکل جیسی چیزیں چلاتے دیکھ کر عجیب سا لگا۔ نازک نازک لڑکیاں بھاری سامان اٹھانے سے ذرا نہیں گھبراتیں۔ یعنی وہاں صنف نازک کا تصور سرے سے موجود ہی نہیں۔ خواجن بے میں ایک چائنیز لڑکی سی سے میری خوب بنتی تھی اور اکثر گپ شپ رہتی تھی اس نے مجھے بتایا چین میں کچھ لوگ بدھ مذہب کے پیروکار ہیں جبکہ زیادہ تر لوگ دہریے یعنی لامذہب ہیں۔ مذہب کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہیں لیکن قانون، اخلاقیات اور نظم و ضبط کی پابندی ضرور کرتے ہیں۔ سوسن نے مجھے چینی لوگوں کی توہم پرستی کے متعلق کچھ دلچسپ معلومات بھی دیں مثلاً ان کے خیال میں کسی کو تحفے میں جوتا دینا اس کی بے عزتی کرنا ہے۔ کسی کو تحفے میں گھڑی دینے کا مطلب ہے اس کا دنیا میں وقت پورا ہو گیا ہے (یعنی موت کی بددعا دینا ہے) یہ لوگ تیرہ کے عدد کو بھی نحس خیال کرتے ہیں اور حتی الامکان اس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے مہینے اور سال کسی نے کسی جانور کے نام پر ہوتے ہیں اور ان کے مطابق اس جانور کی خصوصیات اس میں پائی جاتی ہیں۔ جس طرح ہمارے قمری مہینے ہوتے ہیں بالکل اسی طرح ان کے بھی روایتی مہینے ہوتے ہیں جو چاند کے حساب سے چلتے ہیں۔ روز مرہ زندگی کے معاملات ہماری طرح انگریزی تاریخوں کے مطابق جبکہ اپنے تہوار وغیرہ قمری تواریخ کے تحت مناتے ہیں۔ شادی کی تاریخ، سفر پر جانے یا کسی بھی کام کو شروع کرنے سے پہلے دن کے نیک یا بد ہونے کا تعین کرتے ہیں۔ چین میں ہم نے اکثر عمارتوں مثلاً بنکوں اور پلازوں وغیرہ کے باہر دروازوں کی دونوں اطراف اژدھے، ہاتھی یا شیر کے مجسمے بنے ہوئے دیکھے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ان کے اعتقادات کے مطابق جانوروں کے یہ مجسمے عمارت کی حفاظت اور خیر و برکت کی غایت سے بنائے جاتے ہیں۔ چینیوں کے دیس میں قیام کے دوران بڑی عید بھی آ گئی۔ وطن سے دور عید کرنا اک نیا تجربہ تھا۔ صبح سویرے تیار ہو کر بس سٹاپ پر پہنچے۔

بس کے ذریعے باؤشی لانگ گئے۔ چین میں یہ معمول کے مطابق ایک عام سا دن تھا۔ سب لوگ اپنے روز مرہ کے میں مشغول تھے۔ اس علاقے میں مسلمان زیادہ ہیں اور مساجد بھی موجود ہیں جن میں جمعے اور عیدین کے اجتماعات باقاعدگی سے ہوتے ہیں۔ نماز عید اور خطبے میں چینی خواتین بھی سروں پر ٹوپیاں پہنے یا رومال باندھے مردوں کے ہمراہ تھیں۔ خطبہ چونکہ چینی زبان میں تھا اس لئے کچھ حصہ سر کے اوپر اور کچھ دائیں بائیں سے گزر گیا۔ باہر حلال کھانوں کے سٹال لگے تھے۔ لوگ ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے کھا پی رہے تھے۔ کافی رونق تھی بچے بھی نئے کپڑے پہنے چہک رہے تھے۔ ایک طرف جانوروں کی مختصری منڈی لگی تھی جن لوگوں نے قربانی کرنی تھی وہ اپنے لئے جانور پسند کرنے اور خریداری کیلئے بھاؤ تاؤ کرنے میں مشغول تھے۔ قصاب چھریاں تیز کئے مستعد کھڑے تھے۔ ہم نے بھی خورد و نوش کی کچھ اشیاء خریدیں اور دیار غیر کی عید کے مناظر آنکھوں میں سموئے گھر چلے آئے۔ ہم نے خواجن بے میں 'دیوان خاص' سے دوپہر کا کھانا کھایا جو ایک پاکستانی ہوٹل ہے پھر شنزین کے ایک معروف تفریحی مقام window of the world یعنی دنیا کی کھڑکی کی سیر کا ارادہ کر

لیا۔ یہ بہت خوبصورت جگہ ہے جس میں دنیا بھر سے تقریباً 118 عجوبوں اور معروف مقامات کی نقل اتنی مہارت سے تیار کی گئی ہے کہ اصل کا گمان ہوتا ہے۔ ٹرین پہ سوار ہو کر داخلی گیٹ تک پہنچے اور ٹکٹ لے کر اندر داخل ہو گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ اک جہاں آباد ہے، سامنے ایک بڑا سا گلوب تھا جس کے سامنے کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ساتھ ہی ایفل ٹاور کھڑا تھا جس میں لفٹ کے ذریعے اوپر جانا ممکن ہے۔ ہم برقی زینے کی مدد سے اوپر چڑھے بلندی سے شہر کا نظارہ بھلا لگ رہا تھا۔ اہرام مصر کی سیر کے دوران یوں محسوس ہوا گویا چین کے بجائے مصر آ گئے ہوں۔ اس کے بعد پھر چلتے گئے اور عجائبات کو دیکھ کر محظوظ ہوتے رہے کہیں نیاگرا فال تھا تو کہیں اٹلی کا پیسا ٹاور ۔ پاکستان کی بادشاہی مسجد اور ہندوستان کا تاج محل الگ شان کے ساتھ جلوہ گر تھے۔ اونٹ، قدیم کے کھنڈرات، جیسے مختلف مذاہب کی عبادت گاہیں، محلات، نہریں، پن چکیاں، باغات اور فواروں کے دلکش نظارے دیکھنے والوں کو ورطہ حیرت میں ڈال رہے تھے۔ یہ سب مقامات تعداد میں زیادہ ہونے کے علاوہ کافی فاصلے پر تھے لہذا کچھ حصہ ہم نے مونو ریل پر سوار ہو کر دیکھا جو فضا میں معلق مختصری پٹی پر چلتی ہے اس کے علاوہ منی بس کے ذریعے بھی گھومتے رہے۔ ڈرائیور کے ساتھ ایک لڑکی بطور گائیڈ بیٹھی ہوئی تھی جو ہر جگہ کے متعلق تعارفی معلومات دے رہی تھی ہم بظاہر تو بہترین سامع کا روپ دھارے ہوئے تھے لیکن حقیقت یہ تھی کہ زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم بس یہی جان پائے کہ جگہ کو چینی زبان میں تی فان کہتے ہیں۔ وہاں رنگ برنگے کاسٹیوم بھی دستیاب تھے جنہیں پہن کر لوگ مختلف سوانگ رچا رہے تھے اور ان دلچسپ مناظر کو کیمروں میں مقید کر رہے تھے۔ یہاں اسکیٹنگ اور کشتی رانی کا اہتمام بھی ہے۔ یہ جگہ بلاشبہ قدیم و جدید کا خوبصورت امتزاج ہے جو دیکھنے والوں کو ورلڈ ٹور کا مزا دیتی ہے۔ شام ہوئی تو داخلی دروازے کے سامنے موجود گلوب کھل گیا۔ اس کے اندر سے ایک اسٹیج نمودار ہوا اور سامنے لگی کرسیوں پر لوگ جمع ہونے لگے۔ ہم بھی ٹکٹ لے کر ایک کرسی پر براجمان ہو گئے۔ اسٹیج پر چین کی روایتی موسیقی اور رقص پیش کئے گئے اور ان کے ثقافتی کھیل دکھائے گئے۔ اداکاروں نے اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ کیا اور خوب داد سمیٹی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنی روایات کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں اور اپنی تہذیب و ثقافت پر فخر کرتے ہیں۔ شنزین کا میوزیم بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہاں موجود نوادرات شنزین کی قدیم اور جدید تاریخ کی یادگاریں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں اور عام کا تہذیب کا شفاف آئینہ ہیں۔ یہ لوگ چونکہ فن کے قدردان ہیں اسلئے یہاں کئی آرٹ گیلریاں ہیں جن میں چینی ہنرمندوں کے فن پارے محفوظ ہیں۔ لانگ ہوا کی لائبریری اور آرٹس میوزیم بھی دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو قوم دنیا کی عجائبات کی امین بن رہی ہو وہ بھلا اپنی تاریخ و ثقافت سے کیسے پہلو تہی کر سکتی ہے لہذا شنزین میں ونڈو آف دی ورلڈ کے سامنے ایک جگہ ہیپی ویلی (Happy valley) نام سے موجود ہے۔ یہ جگہ سیاحوں، تاریخ دانوں اور قدیم تہذیب سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کیلئے خصوصی کشش رکھتی ہے کیونکہ یہ چینی اقدار کی بہترین عکاس ہے۔ علاوہ ازیں یہاں جدید قسم کے جھولے اور رولر کوسٹر بھی شائقین کی توجہ کا باعث ہیں۔ یہاں کا واٹر پارک بھی اپنی مثال آپ ہے۔ علاوہ ازیں فوک کلچر ولیج، oct، شنزین سفاری پارک، وائلڈ لائف زو، ژان شان پارک اور لیانہوا شن پارک بھی شنزین کے قابل دید مقامات ہیں۔ چین کی آبادی زیادہ ہے اس لئے باہر نکلو تو ہر طرف ایک ہجوم دکھائی دیتا ہے۔ لوگ البتہ نظم و ضبط کے پابند اور خوش اخلاق ہیں مزید برآں ضروریات اور وسائل میں بھی توازن ہے۔ سفر کے آرام دہ اور بہترین ذرائع میسر ہیں ہوائی سفر کیلئے باؤان ایئر پورٹ موجود ہے۔ بحری سفر کیلئے فیری اور جہاز ہیں۔ زیر زمین چلنے والی میٹرو ٹرین کا اسٹیشن تقریباً ہر اہم جگہ پر موجود ہے ہر اسٹاپ پر ٹرین ہر تین منٹ بعد آتی ہے۔ یہ سفر کا بہت آسان اور سستا ذریعہ ہے۔ شنزین میں تین قسم کی بسیں چلتی ہیں اورنج بس چھوٹے روٹ کیلئے، گرین بس بڑے روٹ کیلئے ان دونوں کے علاوہ ایکسپریس بسیں بھی چلتی ہیں۔ ٹیکسی بھی بآسانی مل جاتی ہے لیکن اس کا کرایہ نسبتاً زیادہ ہے۔ لوگ ذاتی گاڑیاں بھی رکھتے ہیں لیکن زیادہ تر پبلک ٹرانسپورٹ پر انحصار کرتے ہیں کیونکہ یہ سستی اور باسہولت ہے۔ شنزین میں بلٹ ٹرین بھی ہے جو محاورتاً ہی نہیں بلکہ حقیقتاً برق رفتاری سے چلتی ہے۔ اگر حکومت نے عوام کو سہولیات فراہم کی ہیں تو عوام بھی باشعور اور قدردان ہے۔ ہر چیز احتیاط سے استعمال کرتے ہیں اور قانون ضابطوں کی پابندی کرتے ہیں۔ یہ قوم سخت کوش اور محنتی ہے لیکن اوقات فرصت سے بھی لطف اندوز ہونا جانتی ہے۔ کھیل کود اور تفریح کیلئے بوڑھے جوان کی تخصیص نہیں ہے

سب لوگ زندگی اپنے ڈھنگ اور خودمختاری سے جیتے ہیں۔ بیڈمنٹن، ٹیبل ٹینس، ٹینس اور فٹ بال شوق سے کھیلتے ہیں۔ تیراکی، باڈی بلڈنگ، سائیکلنگ وغیرہ بھی کرتے نظر آتے ہیں۔

مجھے ایک روز سوسن کے ساتھ یونیورسیٹی سپورٹس سینٹر جانے کا اتفاق ہوا۔ وہ چھٹی کے روز وہاں ٹینس کھیلنے جاتی تھی۔ اس جگہ ہر کھیل کیلئے باقاعدہ میدان اور سہولیات موجود تھیں۔ یہاں اتھلیٹکس اور جمناسٹک کے مناظر براہ راست دیکھے، والی بال کا میچ دیکھا۔ چینی لوگ پتنگ بازی کا شغف بھی رکھتے ہیں لیکن ہم سے ان معنوں میں مختلف ہیں کہ جب ہم نے پتنگ اڑانی ہو تو چھت پر چڑھتے ہیں جبکہ یہ لوگ ایسی صورت میں پارک کا رخ کرتے ہیں ان کی پتنگیں واٹر پروف ہوتی ہیں جنہیں استعمال کے بعد تہہ کر کے محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ یہ لوگ پیچ لڑانے کے ذوق سے یکسر نابلد اور بوکاٹا کے نعروں سے بھی بے بہرہ ہیں۔ اور تو اور اگر ایک شخص کی پتنگ دوسری سے ٹکرا جائے یا ڈور الجھنے لگے تو باقاعدہ معذرت کرتے ہیں۔ چینی لوگ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں، دوسروں کے معاملات میں خواہ مخواہ مداخلت اور تجسس سے گریزاں رہتے ہیں۔ البتہ اگر ان سے کچھ پوچھا جائے یا مدد مانگی جائے تو خوش خلقی سے پیش آتے ہیں۔ شنوہن چونکہ سمندر کے کنارے واقع ہے اس لئے لوگ سیر و تفریح کیلئے ساحلوں کا رخ بھی کرتے ہیں۔ دامے شا اس شہر کا مشہور اور معروف ترین ساحل ہے۔ یہاں کئی ہوٹل اور ریزورٹ ہیں۔ یہ جگہ کیمپنگ، ہائکنگ، بوٹنگ اور سوئمنگ کیلئے بہترین ہے۔ اب کچھ تذکرہ چاپ سٹکس کھانوں کا بھی سنئے احوال یہ ہے کہ جو بھی شے حرکت کرتی نظر آئے وہ اسے قابل خوردنی گردانتے ہیں۔ نباتات و حیوانات میں سے شاید ہی کچھ ایسا بچا ہو جو ان کے دانتوں تلے آنے سے رہ گیا ہو۔ سپر سٹور میں بھی گوشت کا کاؤنٹر ہم جیسے گھاس کی چاٹ رکھنے والوں کیلئے خاصی دلچسپی کا باعث تھا۔ سی فوڈ میں بھی ان کے پاس بہت ورائٹی ہے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ شیشے کے بہت سے ایکوریم قطار در قطار رکھے ہیں۔ ہر ڈبے میں ایک الگ مخلوق اپنی زندگی کے آخری ایام عالم بے خبری میں بسر کر رہی ہے۔ خریدار آ کر ایک چمٹے کی مدد سے حسب منشاء جاندار ایک شاپر میں ڈال کر برقی ترازو پر رکھ دیتا ہے۔ جتنی دیر میں اس پھڑکتی ہوئی شے کا بل بنتا ہے اس کی روح فانی دنیا سے کوچ کر جاتی ہے۔ یہ لوگ سی فوڈ کو مٹی کے بڑے بڑے سٹیمروں میں سٹیم کر کے یا ابال کر کھاتے ہیں ہماری طرح صرف مرغی کے انڈے تک محدود نہیں، بلکہ ہر پرندے کے انڈے دستیاب ہیں اور اس کی تصویر شناخت کیلئے پیکٹ پر بنی ہوتی ہے۔ بہت سے نئے پھل اور سبزیوں سے بھی ہم وہاں جا کر ہی متعارف ہوئے خصوصاً ڈریگن نامی پھل تو ذائقے کے علاوہ دیکھنے میں بھی خوبصورت معلوم ہوا۔ یہ سفید رنگ پر تخم ملنگا جیسے دانے سجائے گلابی چھلکے میں چھپا ہوتا ہے۔ ڈرائی فروٹ کی طرف جائیے تو الگ حیرت کا در وا ہوتا ہے بہت سی نئی چیزوں کے ساتھ ساتھ کیکڑے، مالٹے اور سالم مچھلیاں تک خشک ہو کر نشان عبرت بنی ہوئی تھیں۔ بڑے ہوٹلوں کے علاوہ بے شمار اسٹریٹ فوڈز موجود ہیں جا بجا فاقل، نگٹس، اوبسٹر، ایمبر گر اور ڈمپلنگ کی ریڑھیاں نظر آتی ہیں۔ گھر پر کھانا بنانے کا رواج کم ہے۔ باہر کھانے کو ترجیح دی جاتی ہے کیونکہ ان کے مطابق کھانا بنانے میں بہت وقت ضائع ہوتا ہے۔ چینی لوگ چونکہ سانولی جلد پسند نہیں کرتے اس لئے دھوپ سے بچنے کیلئے چھتری استعمال کرتے ہیں۔ شنوہن میں تو یہ اہتمام اسلئے بھی ضروری ہے کیونکہ یہاں بارش بھی یکدم آ موجود ہوتی ہے۔ وہاں اکثر لوگوں کو گلیوں اور فٹ پاتھوں کے کنارے میز پر لکڑی کے بلاکوں سے کھیلتے دیکھا۔ ہم تو اس کھیل سے انجان ہی رہے مگر لوگوں کو گھورو دیکھ کر جانا کہ کوئی دلچسپ کام ہے۔ دیار غیر میں تین ماہ گزرنے کا بالکل احساس نہ ہوا اور واپسی کی گھڑی آن پہنچی اور ہم دسمبر 2013 کی آخری تاریخوں میں یادوں کی کہکشاں ہمراہ لئے وطن واپس لوٹ آئے۔

تجھ بن جی لوں ایسا سوچ رہا ہوں
شاید یہ میں اچھا سوچ رہا ہوں
تو چاہے نہ چاہے میں تو چاہوں
میری جاں یہ کیسا سوچ رہا ہوں
مجھ تک ہاتھ بڑھانے سے تو بھاگے
تجھ سے نہ میں ملنا سوچ رہا ہوں
تیری چکنی باتوں میں جو آیا
کون ہے مجھ سا پگلا سوچ رہا ہوں
مطلب والوں کو مطلب سے مطلب
ایسے کیسے چلنا سوچ رہا ہوں
ساگر ہر پل دور رہا وہ مجھ سے
جس کو جتنا چاہا سوچ رہا ہوں
صدام ساگر/گوجرانوالہ

جگری یار

موپساں/ترجمہ: سمندر منصوری/لاہور

جنگ کی وجہ سے افلاس اور قحط نے پیرس کو اپنے بھوکے جبڑوں میں یوں دبایا ہوا تھا کہ چھتوں پر بیٹھنے والے پرندے اور نالوں میں رہنے والے چوہے بھی سوکھے کا شکار ہونے لگے تھے۔ انسانوں کا یہ حال تھا کہ انہیں کھانے کے لیے جو بھی مل جاتا کھا لیتے۔ یہ جنوری کی ایک چمکتی ہوئی صبح تھی موسیو موریسو جو کہ پیشے کے اعتبار سے ایک گھڑی ساز تھا اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے پاجامے کی جیبوں میں ٹھونسے ہوئے خالی پیٹ پیرس کی بڑی شاہراہ پر چہل قدمی کر رہا تھا کہ اچانک اس کا آمنا سامنا ایک پرانے شناسا موسیو سیوج جو کہ ایک استاد جگری یار تھا سے ہوا۔ جنگ چھڑنے سے پہلے موریسو کی یہ عادت تھی کہ وہ ہر اتوار کی صبح ہاتھ میں بانس کی چھڑی پکڑے کندھے پہ ٹین کا باکس رکھے Argenteuil کی ٹرین پکڑ کر Colombes پہنچتا اور پھر مرنٹی کی طرف چل پڑتا اور دریا کے کنارے پر پہنچ جاتا اپنے سپنوں کے اس مقام پر پہنچتے ہی وہ مچھلیوں کا شکار شروع کر دیتا۔۔۔۔ وہ مچھلیوں کا شکار کرتا رہتا یہاں تک کہ رات کی دیوی اپنی زلفیں کھول دیتی۔ اور ہر اتوار کی صبح بالکل اسی جگہ اس کا آمنا سامنا اسی شناسا چھوٹے قد کے موٹے تازے اور خوش و خرم موسیو سیوج سے ہوتا جو کہ ریتو نے ڈم دی نوٹرے میں پارچہ فروش ہونے کے ساتھ ساتھ جگری یاری کا بھی ماہر تھا۔ اکثر یوں ہوتا کہ آدھے آدھے دن تک یہ دونوں مچھلیاں پکڑنے کے لیے کانٹے پانی میں رکھے ہوئے ایک دوسرے کے قریب قریب بیٹھے رہتے اور یوں آہستہ آہستہ یہ دونوں گہرے دوست بن گئے۔ کبھی کبھار وہ بات نہ کر رہے ہوتے اور کبھی مسلسل گپ شپ کرتے مگر ان کی دوستی کو الفاظ کی ضرورت نہیں تھی وہ ایک دوسرے کو بڑی اچھی طرح سے جانتے تھے۔ ان دونوں کی سوچیں اور احساسات بہت حد تک ایک جیسی تھیں۔ موسمِ بہار میں جب صبح کے دس بجے سورج کی کرنیں پانیوں کے ساتھ اٹھکیلیاں کرنے کے ساتھ ساتھ ان پرجوش جگری یاروں (کنڈی سے مچھلی پکڑنے والے) کے کندھوں اور کمر پر اپنا شفیق گرم ہاتھ رکھتیں تو ایسے میں موریسو اپنے پڑوسی سے کہتا۔

"میرا خیال ہے کہ آج موسم خاصا خوشگوار ہے"۔

جس پر دوسرا جواب دیتا

"ہاں میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بہتر تصور نہیں کیا جا سکتا"۔

اور یہی چند الفاظ کافی ہوتے تھے وہ سمجھ جاتے تھے ایک دوسرے کی تعریف کو۔ اور سردیوں میں جب دن کا اختتام قریب ہوتا تھا اور اور مغربی افق پر غروب ہوتا ہوا سورج دریا کے شفاف پانی میں خون کی سی سرخی ملانے لگتا اور دریا کا سارا پانی سورج کی کرنوں سے لال ولال ہو جاتا یہاں تک کہ یہ لالی دونوں دوستوں کے چہروں پر بھی بڑی نمایاں دکھائی دینے لگتی اور یہی کرنیں دریا کے اردگرد موجود درختوں جن کے پتے خزاں کی آمد کے ساتھ ہی جھڑ چکے تھے پر جلوہ کاری کرتیں تو موسیو سیوج مسکرا کر موریسو کی طرف دیکھتا اور کہتا۔

"کیا ہی شاندار نظارہ ہے"۔

اور پھر ضروری ہوتا کہ موریسو اپنے کانٹے کے کانٹے سے نظر ہٹائے بنا یوں جواب دیتا۔

"ہاں یقیناً یہ نظارہ شہر کی بڑی شاہراہ سے بہت بہتر ہے۔۔۔۔ بہتا"۔

جونہی انہوں نے ایک دوسرے کی موجودگی محسوس کی یکبارگی انہوں نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

"اوہ۔۔۔۔ ہر طرف افسردگی چھائی ہوئی ہے" موسیو سیوج نے کہا۔

موریسو نے دکھ بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "مگر آج کا موسم۔۔۔ شاید یہ سال کا پہلا اچھا دن ہے"۔

آسمان کا رنگ واقعتاً گہرا نیلا اور بادلوں سے پاک تھا۔ وہ اپنے غیر مرتعش اجسام کو اٹھائے کچھ دور تک ساتھ ساتھ چلتے رہے اور مچھلیوں کے شکار کے بارے میں سوچتے رہے۔۔۔

"کیا ہی اچھے دن تھے" موریسو نے ماضی کی گہرائی میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"نجانے کب ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ پھر سے مچھلیوں کا شکار کھیلنے جا سکیں"۔ موسیو سیوج نے خود کلامی کے انداز میں پوچھا۔

اسی دوران وہ ایک چھوٹے سے کیفے میں داخل ہوئے اور دونوں نے مل کر ابسنتھ (فرانسیسی شراب) پی۔ اور اس کے بعد وہ پھر سے پختہ سڑک کے ہمراہ آگے بڑھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد موریسو اچانک رکتے ہوئے بولا کیا ہم ایک اور ابسنتھ لے سکتے ہیں؟ "اگر تم پسند کرو تو" موسیو سیوج نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ اور وہ شراب کی ایک اور دکان میں گھس گئے۔ جب وہ وہاں سے باہر نکلے تو مکمل طور پر لڑکھڑا رہے تھے اور اس کی وجہ ان کے خالی معدوں پر الکوحل کا اثر پذیر ہونا تھا۔ آج موسم

اچھا اور خوبصورت تھا۔ ٹھنڈی ہوا اُن کے چہروں کو چھوتے ہوئے گزر رہی تھی۔ اس ٹھنڈی مگر تازہ ہوا نے الکوحل کے ساتھ مل کر موسیو سیوج کو مکمل طور پر مدہوش کر دیا۔

"فرض کرو کہ ہم وہاں چلتے ہیں"۔ اُسنے اچانک رُکتے ہوئے کہا۔

موریسو "کہاں"

سیوج "مچھلیاں پکڑنے"

موریسو "مگر کہاں"

سیوج "کیوں کہاں؟ اُسی پُرانی جگہ۔ فرانسسی چوکیاں (چھاونی) Colombes کے بالکل قریب ہیں اور میرے ایک شناسا ہیں کرنل دامیولن جس کے ذریعے ہمیں آسانی سے وہاں جانے کی اجازت مل جائے گی"

یہ کہتے ہوئے سیوج خواہش اور اُمید کے شدید جذبوں سے کانپ رہا تھا۔

موریسو "بہت اچھے میں تیار ہوں"۔ اور وہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر اپنے اپنے کانٹے اور پاس لینے چلے گئے تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ دونوں بڑی سڑک پر ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں وہ کرنل کے گھر میں موجود تھے۔ اس نے اُن کی درخواست مُسکراتے ہوئے منظور کر لی سو انہوں نے دوبارہ اپنا سفر جاری کیا مگر اب وہ ایک خفیہ فوجی کوڈ (پاس ورڈ) سے آراستہ تھے ویران Colombes کی طرف جاتے ہوئے جلد ہی اُنہوں نے چوکیاں پیچھے چھوڑ دیں اور وین یارڈز (انگوروں کے باغات) کے مضافات میں پہنچ گئے جس کی حدیں سین سے جا ملتی تھیں، جب تقریباً ۱۱ بج رہے تھے۔ Argenteuil کا گاؤں اُن کے سامنے زندگی کی رمق سے عاری خاموش و سنسان پڑا تھا۔ اُن کے سامنے بکھرے ہوئے منظر میں "اورجمو اور سنوا" کی بلند چوٹیوں کے علاوہ وہ طویل اور لق و دق میدان تھا جس میں جگہ جگہ کٹرے چیری کے ننگے بچے درخت اور سخت گیر بھوری زمین فضلے کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ موسیو سیوج بلند چوٹیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے زیر لب بڑبڑایا۔

"پروشیائی وہاں ہیں"

اور گاؤں کے ویران منظر نے دونوں دوستوں کے دلوں کو گمان اور بے یقینی سے بھر دیا۔ پروشیائی دشمن کو انہوں نے اب تک کبھی نہیں دیکھا تھا مگر پھر بھی وہ پیرس کے پڑوس میں ان کی موجودگی کو مہینوں سے محسوس کر سکتے تھے۔ فرانس کو برباد کرنے والوں لوٹنے والوں اور یہاں پر بھوک و افلاس پھیلانے والوں نے اُنکے دلوں میں اس فاتح قوم کے لیے نفرت کے ساتھ ایک توہم پرستانہ خوف بھی جلا دیا تھا۔

"فرض کرو کہ ہماری ان میں سے کسی سے مڈھ بھیڑ ہو جائے" موریسو نے کہا۔

"تو ہم ان کو کچھ مچھلی پیش کریں گے"۔ اسی مخصوص فرانسسی روشن خیالی اور نرم دلی کے ساتھ جس کی روشنی کوئی بھی طاقت مکمل طور پر نہیں بجھا سکتی"

موسیو سیوج نے فخریہ انداز میں جواب دیا۔ اس کھلے اور خالی میدان میں اُن کو اپنے وجود بہت نمایاں دکھائی دینے لگے جس کی وجہ سے وہ خوف زدہ ہو کر آگے بڑھنے سے ہچکچا رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اُن کے چاروں طرف خاموشی نے خوفزدہ کر دینے والی سلطنت قائم کر رکھی ہو۔ آخر کار موسیو سیوج نے بہادری کا مظاہرا کرتے ہوئے کہا

"آؤ اب ہمیں آغاز کر لینا چاہیے بس تھوڑے سے احتیاط کی ضرورت ہو گی"۔

اور وہ انگوروں کی بیلوں سے لوٹتے بکھرتے دُہرے سیدھے ہوتے اپنے کان اور آنکھیں مکمل طور پر بیدار رکھتے ہوئے دریاء کے کنارے کی طرف بڑھنے لگے اب دریاء کے کنارے تک پہنچنے کے لیے اُن کو ایک چھوٹے مگر ننگے میدان سے گزرنا تھا۔ سو یہاں سے اُنہوں نے خود کو خشک سرکنڈوں میں چھپاتے ہوئے کنارے کی طرف دوڑ لگا دی۔ دریاء کے کنارے پر پہنچ کر موریسو نے اپنا کان زمین کے ساتھ لگا لیا تا کہ اندازہ لگا سکے کہ کہیں دور یا نزدیک قدموں کی آہٹ تو نہیں ہو رہی اور جب اس نے خوب تسلی کر لی تو وہ شکار کرنے لگے۔ اُن کے سامنے مُرتنی کا شکستہ اور تباہ حال جزیرہ تھا جس کی وجہ سے دوسرے کنارے سے اُن پر کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ جزیرے پر موجود چھوٹا سا ہوٹل مقفل تھا اور یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ صدیوں سے شکستہ و سنسان ہو۔ پہلی چھوٹی سی مچھلی موسیو سیوج کے حصے میں آئی اور اس کے ساتھ ہی موریسو نے دوسری مچھلی کو قابو کر لیا۔ آج شکار اتنا زیادہ تھا کہ ہر لمحہ سیوج یا پھر موریسو اپنے کانٹے کو پانی سے کھینچتا اور ایک چھوٹی سی چاندی کی طرح چمکتی ہوئی مچھلی اُس کے ساتھ لگی ہوتی یوں تھوڑی ہی دیر میں اُن کے پاس شکار کی ہوئی مچھلیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ اُنہوں نے اپنی شکار کردہ مچھلیوں کو اپنے پیروں میں پڑے ہوئے بند گلے والی جالی دار تھیلی میں ڈال دیا وہ بے حد خوشی محسوس کر رہے تھے ایک ایسی تفریح کو دوبارہ حاصل کرنے کی خوشی جس سے اُن کو ایک طویل عرصہ تک محروم رکھا گیا تھا۔ سورج نے اپنی کرنیں اُن کی پیٹھ پر اُنڈھیلنا شروع کر دی مگر اُن کو پرواہ نہیں تھی۔ وہ نہ تو کچھ سُننا چاہتے تھے اور نہ ہی کچھ دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ ساری دنیا سے بے خبر ہو کر شکار کھیلنا چاہتے تھے صرف اور صرف مچھلیوں کا شکار۔ کہ اچانک اُنہیں گھن گرج کی زوردار آواز سُنائی دی اور زمین یوں ہلنے لگی کہ زلزلے کا گمان ہونے لگا یوں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ آواز زمین کا سینہ چیر کر اُن کے کانوں

کے پردے پھاڑ دے گی۔ موریسو نے اپنے سر کو بائیں طرف گھماتے ہوئے آواز کی سمت میں دور تک نظریں دوڑائیں تو اُسے ویلیرین کی چوٹی سے برستی ہوئی آگ اور اُس سے اُٹھنے والے دھوئیں کے بادل دکھائی دیئے۔ توپوں نے اپنے گولے آسمانی بجلی کی طرح برسانا شروع کر دیئے تھے۔ زمین طوفان کی زد میں آئی ہوئی ناؤ کی طرح ہچکولے کھا رہی تھی پہاڑ کی چوٹیوں کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ اپنی زندگی کی آخری ہچکیاں لے رہی ہیں اور اُن کی روح سفید ململی کپڑے سے جلتے چلتے دھوئیں کا روپ دھارن کیے آسمانوں کی طرف جا رہی ہے جبکہ موت کا یہ خوف زدہ کر دینے والا دھواں آہستہ آہستہ اس جنت نظیر اور پُر امن ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ موسیو سیوج نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔

"یہ پھر سے وہی لوگ ہیں"۔

موریسو اپنے کانٹے کی پانی میں ڈوبتی تیرتی کانی پر نظر جمائے ایک پُر امن انسان کی طرح اُس پاگل شخص کی بے وقوفی پر جو کہ پہاڑ کی چوٹی سے آگ برسا رہا تھا غصے اور بے صبری سے جلتے بھنتے ہوئے بولا۔

"یہ کس قدر بے وقوف ہیں کہ ایک دوسرے کو اس طرح مرنے مارنے پر تلے ہوئے ہیں"

"یہ درندوں سے بھی زیادہ وحشی ہیں"۔ سیوج نے لقمہ دیتے ہوئے کہا۔

موریسو جس کے کانٹے میں ایک کالی اور خوبصورت مچھلی پھنسی ہوئی تھی کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

"اور یہ تب تک ہوتا رہے گا کہ جب تک آئین حکومت نہ بدلا جائے"۔

سیوج نے اصلاحی انداز میں کہا" جمہور کو اعلان جنگ نہیں کرنا چاہیے تھا"۔

موریسو نے سیوج کی بات میں مداخلت کرتے ہوئے کہا" بادشاہت کا مطلب ہے دوسرے ملکوں سے جنگیں لڑنا اور جمہور خانہ جنگی کا دوسرا نام ہے"۔

پھر دونوں حقیقت پسندانہ امن شہریوں کی طرح پُرسکون اور نرم الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے ملکی سیاسی مسائل کے بارے میں بحث کرنے لگے اور ایک نقطے پہ دونوں متفق ہو گئے کہ کوئی بھی انسان مکمل طور پر آزاد نہیں ہو سکتا۔ جبکہ ویلیرین پہاڑ کی چوٹی سے مسلسل آسمانی بجلیاں برسائی جا رہی تھیں۔ جو کہ نہ صرف فرانسیسیوں کے گھروں کو اپنے بارودی گولوں سے نیست و نابود کر رہی تھیں بلکہ بے شمار انسانی اجسام کو جلا کر راکھ کرنے کے ساتھ ساتھ سینکڑوں سپنوں کو توڑ رہی تھی اور ہزاروں دلوں میں پنپتی ہوئی خواہشات کا گلہ دبا رہی تھی۔ توپوں کے دہانوں سے اگلتی ہوئی یہ آگ بے شمار ماؤں کی گودیں سونی کر رہی تھی، کتنی ہی سہاگنوں کو ابھاگن کیے جا رہی تھی، بیٹیوں کے سروں سے شفیق باپوں کا سایہ چھینے پر تلی ہوئی تھی اور بہنوں کے ہونٹوں سے مسکراہٹ چھین کر اُن کی آنکھوں میں آنسو بھرتی جا رہی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ توپیں مخالف اور اپنے وطن دونوں کے باسیوں کو تباہی کا پیغام دے رہی تھیں۔

"شاید اسی کا نام زندگی ہے"۔ موسیو سیوج نے کہا۔

"زندگی نہیں بلکہ اسے موت کہو" موریسو نے تلخ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

مگر اچانک پیچھے کی جانب سے آتے ہوئے قدموں کی آہٹ سے اُن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور اُنھوں نے گھبراہٹ میں پیچھے کی طرف مُڑ کر دیکھا۔ چار دراز قد لمبی داڑھیوں والے عسکری وردیوں میں ملبوس سروں پر فلیٹ ٹوپیاں پہنے جوان اُن کے سر پر پہنچ چکے تھے۔ جبکہ اُن کے پیچھے مُڑ کر دیکھنے پر انھوں نے اپنی بندوقیں اُن دونوں جیسی بازو پر تان لیں۔ خوف کے مارے اُن دونوں کے ہاتھوں سے بانس چھوٹ کر دریا میں جا گرے اور دریا کے بہاؤ کے ساتھ بہنے لگے۔ پلک جھپکتے ہی اُن کو قابو کر کے پابہ سلاسل کر لیا گیا اور کشتی میں ڈال کر مرتی کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ اس ہوٹل کے پیچھے جو کہ شکستہ حال دکھائی دے رہا تھا متعدد جرمن فوجی موجود تھے۔ ایک اُلجھے ہوئے بالوں والا دیو ہیکل افسر جو کہ کرسی پر ٹانگیں پھیلائے براجمان تھا اپنے خوبصورت مٹی کے بنے پائپ کا کش لگاتے ہوئے نفیس فرانسیسی زبان میں اُن سے مخاطب ہوا۔

"اچھا تو میرے معزز مہمانوں یہ بتاؤ آج مچھلیوں کے شکار کے دوران آپ کتنے خوش قسمت رہے"۔

پھر ایک فوجی نے مچھلیوں سے بھرا ہوا تھیلا اس کے پیروں کے پاس اُنڈیل دیا۔

پروشیائی افسر مسکراتے ہوئے بولا" ہوں میرا خیال ہے کہ یہ کچھ بُری نوعیت نہیں ہیں مگر اس وقت ہمیں کسی اور موضوع پر بات کرنے کی ضرورت ہے۔ میری بات کو غور سے سنو اور ہوشیار بننے کی کوشش مت کرنا۔ تم لوگ میری آنکھوں میں دیکھ چکے ہو گے کہ میں اس بات سے باخبر ہوں کہ تم دونوں جاسوس ہو اور اس لیے بھیجے گئے ہو کہ میری فوج کی حرکات و سکنات پر نظر رکھو۔ اسی وجہ سے میں نے تم دونوں کو بندی کر لیا ہے اور اب تمھیں گولی سے اُڑا دیا جائے گا۔ تم لوگوں نے مچھلیاں پکڑنے کا ڈرامہ رچایا جب کہ تمہارا مقصد کچھ اور ہی تھا مگر اب تم میرے ہتھے چڑھ گئے ہو اور یقیناً اپنے کیے کی سزا بھی بھگتو گے۔ شاید اسی کو جنگ کہتے ہیں۔ مگر ہاں ۔۔۔۔ تم چونکہ وہاں کی فوجی چھاؤنیوں سے گزر کر آئے ہو تو یقیناً تم لوگوں کے پاس واپسی کا خفیہ فوجی کوڈ بھی ضرور ہو گا۔ اگر تم

مجھے وہ خفیہ فوجی کوڈ بتا دو تو میں نہ صرف تم کو معاف کر دوں گا بلکہ واپس بھی جانے دوں گا"۔

دونوں دوست خوف کی وجہ سے اپنے چہروں پر موت کی سی پیلاہٹ لیے ساتھ ساتھ کھڑے تھے اُن کے نحیف ہاتھوں میں ہونے والی تھرتھراہٹ اُن کے جذبات کی چغلی کھا رہی تھی۔

"کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی"

دیو ہیکل فوجی افسر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ پُرامن طریقے سے اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ گے اور یہ راز تمہارے ساتھ ہی چلا جائے گا۔ لیکن اگر تم دونوں نہیں بتاؤ گے تو اسکا مطلب ہوگا موت۔۔۔۔فوری موت۔اب بتاؤ اور مرضی تم دونوں کی ہے"۔

وہ بغیر ہونٹ ہلائے ساکت و جامد کھڑے رہے۔ پروشیائی افسر مکمل طور پر مطمئن ہو کر اپنے بازو پھیلاتے ہوئے دریاہ کے رخ کھڑا ہوگیا۔

"سوچ لو صرف پانچ منٹ کے بعد تمہاری لاشیں دریاہ کی تہہ میں ہونگی۔تم لوگوں کے خونی رشتہ دار تو ضرور ہونگے ۔۔۔۔میں وعدہ کرتا ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔"

ولیرین اب تک گرج رہا تھا۔دونوں جسی باز خاموش کھڑے رہے۔ جرمن افسر نے اُن کی طرف رخ کرتے ہوئے جرمن زبان میں آرڈر دیا۔اور پھر اس نے اپنی کرسی وہاں سے تھوڑی دور رکھوادی تا کہ وہ قیدیوں کے زیادہ قریب نہ ہو۔ درجن بھر سپاہی جنھوں نے ہاتھوں میں بندوقیں پکڑی ہوئی تھیں نے آگے بڑھ کر اُن دونوں سے بیس قدم کے فاصلے پر پوزیشن سنبھال لی۔

"میں تم لوگوں کو مزید ایک منٹ دیتا ہوں صرف ایک دو بھی نہیں"۔

اور پھر وہ تیزی سے اُٹھ کر دونوں فرانسیسیوں کے پاس آیا۔اُس نے موریسو کو بازو سے پکڑا اور تھوڑا سا دور لیجا کر اس سے سرگوشی میں کہا۔

"جلدی کرو مجھے خفیہ کوڈ بتا دو تمہارے دوست کو خبر تک نہیں ہوگی میں تم کو چھوڑ دوں گا اور تمہارے دوست کو بہانہ کر دوں گا کہ مجھے اس پر رحم آ گیا تھا"۔

موریسو نے منہ سے کوئی لفظ نا نکالا۔پھر وہ موسیو سیوج کو ایک طرف لے گیا اور اُس کو بھی وہی لالچ دیا مگر سیوج بھی خاموش رہا۔وہ دونوں ایک بار پھر ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔افسر نے اپنا حکم جاری کیا اور فوجیوں نے اپنی بندوقیں سنبھال لی کہ اچانک موریسو کی نظر اتفاقی طور پر خوبصورت چھوٹی مچھلیوں سے بھرے تھیلے پر پڑی جو کہ اُس سے چند قدم کے فاصلے پر گھاس میں پڑا ہوا تھا سورج کی شریر کرنوں میں تڑپتی ہوئی مچھلی چاندی کی طرح چمک رہی تھی۔اُس کا دل ڈوبنے لگا اور خود پر قابو پانے کے باوجود اُس کی آنکھیں بھرآ گئیں۔

"الوداع" موسیو سیوج اُس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کہا۔

"الوداع" موریسو سیوج نے جواب دیا۔اُنھوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا۔وہ دونوں خوف کے مارے سر سے لیکر پاؤں تک کپکپا رہے تھے۔افسر چلایا فائر بیک وقت بارہ گولیاں چلیں۔موسیو سیوج فوری طور پر آگے کی طرف گر پڑا جبکہ موریسو جو کہ اُس کے مقابلے میں زیادہ قوی اور لمبا تھا تھوڑی دیر لڑکھڑانے کے بعد اپنے دوست کے پاس ہی آسمان کی طرف منہ کر کے گر پڑا اور اس کے سینے سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔جرمن نے تازہ آرڈر جاری کر دیا۔اُس کے فوجی تھوڑی دیر کے لیے ادھر اُدھر ہو گئے اور جب وہ واپس آئے تو اُن کے ہاتھوں میں رسیاں اور پتھر تھے۔اُنھوں نے دونوں دوستوں کے پیروں میں پتھر باندھ دیے اور پھر اُن کو دریا کے کنارے پر لے گئے۔ولیرین پہاڑ کی چوٹی اور ڈھلان اب مکمل طور پر سفید دھوئیں میں دفن ہو چکی تھی۔جب کہ آگ اب بھی برس رہی تھی۔دو سپاہیوں نے موریسو کی لاش کو سر اور پاؤں سے مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا جبکہ دوسرے دو نے سیوج کو۔لاشوں کو مضبوط ہاتھوں نے ہوا میں جھولے کی طرح لہرایا اور پوری طاقت سے دریاہ کی طرف اُچھال دیا۔دونوں لاشیں ہوا میں خم دار لکیر بناتے ہوئے پیروں کے بل پانی میں جا گری جس کی وجہ سے دریاہ کا پانی ہوا میں لہرانے کے بعد جھاگ بنا کر ایک بھنور کی شکل اختیار کرتا ہوا شانت ہو گیا۔مگر اس ارتعاش کے نتیجے میں کچھ معصوم لہریں دریاہ کے کناروں سے جا ٹکرائیں جبکہ خون کی چند لکیریں سطح آب پر نمودار ہونے کے بعد ہمیشہ کے لیے غائب ہو گئیں۔افسر جو کہ مکمل طور پر پُرسکون تھا نے انتہائی سنگین مزاحیہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔میرا خیال ہے کہ اب مچھلیوں کی باری ہے۔

اور پھر وہ واپس گھر آیا جہاں اُس کی نظر اچانک نظر انداز کی جانے والی مچھلیوں پر پڑی جو کہ جالی والے تھیلے میں موجود گھاس پر پڑی ہوئی تھیں۔اُس نے اُن کو اُٹھایا اُن کا بغور معائنہ کرنے کے بعد مسکراتے ہوئے ولیئم کو آواز دی۔ایک سپاہی جس نے کہ سفید رنگ کا ایپرن باندھا ہوا تھا دوڑتا ہوا آیا۔اور پھر پروشیائی افسر نے دو قتل کیے گئے لوگوں کا شکار اُس کی طرف اُچھالتے ہوئے کہا۔کیا تم فوری طور پر میرے لیے یہ مچھلیاں فرائی کر سکتے ہو کیونکہ یہ اب تک تازہ اور زندہ ہیں۔میرا خیال ہے کہ یہ بہت مزیدار ہونگیں۔اور پھر اُس نے اپنے پائپ کا ایک طویل کش لگایا۔

افسانہ

آنکھوں کے راز اور خول

ثمین علی/ناسمرہ

وہ سیاہ آنکھوں نے مجھ پر ایک کہانی لکھنے کا دباؤ ڈالا ہے۔ میں ٹیب ہاتھ میں لیے لکھنے بیٹھی ہوں اور ان کالی سیاہ آنکھوں کی تحریر کے پیچھے خیالات کا ایک سیل رواں ہے کہ بند توڑ کر بہتا چلا آ رہا ہے۔ کئی بار کہانی خود کو لکھواتی ہے جیسے بارش خود بخود برسنے لگ جاتی ہے مگر کئی بار کہانی لکھنے سے قبل یہ سوچنا پڑتا ہے کہ کیا لکھیں؟ ہمارے ارد گرد ہر انسان ایک ماسٹر پیس کہانی ہے اور ہر چہرہ ایک شاہکار پینٹنگ۔ ہاں مگر چہرے صرف مصوری کے نمونے ہی نہیں بلکہ ہر چہرے ایک راز ہیں اور آنکھیں وہ روزن جن سے کئی بار اندر کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔ ہر انسان اپنے اوپر کئی خول چڑھائے پھرتا ہے۔ کیا ضروری ہے کہ ان خولوں کو منافقت یا الگ الگ چہروں کے خول سمجھا جائے۔ بس کچھ ایسا ہر ذی روح کے اندر موجود ہے جو وہ پبلک نہیں کرنا چاہتا بلکہ شاید کسی کو بھی وہ سب دکھانا نہیں چاہتا۔

مصنف بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ادھر ادھر کی باتیں لکھیں گے، نظریات کے خول میں چھپیں گے۔ علامتوں استعاروں میں ملفوف ہونے کی کوشش کریں گے۔ مگر کئی بار شعوری یا لاشعوری طور پر اپنے اندرون کی ایک ہلکی سی درز کھول کر محض چند کرنوں کو باہر کی راہ دکھا دیتے ہیں۔

پھر بہت واہ واہ ہوتی ہے۔ ہاں یہ آپ سب کے ساتھ ہوا ہوگا کہ آپ کی توقع کے برعکس کسی سادہ سی اور عام سی تحریر کو بڑی پذیرائی مل جائے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہم اپنے خول کے اندر جو سنبھالے بیٹھے ہیں کیا دیگر سب لوگوں کے اندر بھی کچھ ویسا ہی ہے؟ لوگ اس تحریر کو پسند کرتے ہیں جو وہ خود لکھنا چاہتے تھے مگر وہ جو لکھ نہیں پاتے۔ جب کوئی اور وہی سب لکھ دیتا ہے تو کیسی طمانیت ملتی ہے۔ شاید وہ طمانیت اپنے اندر کا خول برقرار رہ جانے کی بھی ہوتی ہے۔

سننے اور پڑھنے والا کس طرح دل سے نکلی آواز اور تحریر کو پہچان جاتا ہے؟ پھر وہی سوال کیا کہ اتنے تنوع میں جہاں انگلیوں کی پوریں تک نہیں ملتی آنکھوں کے نمونے نہیں ملتے پھر بھی ہم سب کے اندر اگر کچھ مشترک سا ہے تو وہ کیا ہے؟

وہ بہت دلیر اور بڑے ادیب ہوتے ہیں یا بہت عام سے لوگ بھی جو اس اپنے اس فطری خول میں سے ایک کھڑکی کھول سکتے ہیں۔ اور اس کھڑکی سے نکل کر ہزاروں لوگوں کے دلوں میں نہاں خانوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ ان عام سے لوگوں کی خاص سی آنکھیں وہ روزن ہیں جو من کے اندر چھپے راز آشکار کرتی ہیں اور محسوسات کی ترسیل بھی۔

میں ایک فاسٹ فوڈ ریسٹوران میں کھانے کا آرڈر دینے کے لیے اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی کہ اپنے قریب کھڑی ایک لڑکی جس کی عمر پندرہ سولہ سال ہوگی کے چہرے نے مجھے کسی مقناطیس کی مانند اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

اتنا سیاہ چہرہ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ میں نے تقریباً ہر افریقی نسل کے لوگ دیکھے ہیں۔ میانہ قد چپٹی ناک والوں سے لے کر طویل قامت اور حبشی سیاہ فام جن کی رنگت کے شیڈ براؤن کافی، کاکاؤ سے لے کر سیاہی مائل تک ہوتے ہیں۔ مگر اتنی چمکیلی سیاہ رنگت کبھی نہیں دیکھی تھی۔ شاید اس کی جلد میں میلانن کے سب سے زیادہ پگمنٹ ہوں گے۔ مجھے کالے چہروں سے بےزاری نہیں ہوتی مگر مجھے یہ تسلیم کر لینے دیجیے کہ ایسا ہمیشہ سے نہ تھا۔ امی جی نے مجھے ایک بار کہا تھا کہ کسی بھی چہرے پر حقارت کی نگاہ نہیں کرتے کسی کے چہرے کا تصور کر کے بھی تھوکتے نہیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب بچوں کو ابتدائی آداب سکھائے جاتے ہیں۔ میں نے پوچھا امی جی کیوں بھلا؟

امی نے جواب دیا کہ اس لیے کہ ہر انسان کے چہرے پر رب کا ہاتھ پھرا ہوتا ہے۔

آخر دنیا میں اتنے زیادہ انسان ہیں ہر انسان کے چہرے پر اللہ تعالیٰ اپنا ہاتھ کس طرح پھیر سکتا ہے؟

"ھوالذی یصورکم فی الارحام کیف یشاء"

جواباً امی یہ کہتیں۔ ہاں مجھے کبھی بھی انہوں نے اس آیت کی اردو نہیں بتائی تھی نہ میں نے پوچھی یہاں تک کہ خود ترجمہ پڑھا اور اس آیت کا مفہوم نظر سے گزرا۔

اس کے باوجود مجھے چہروں میں چھپے اسرار کی پوری سمجھ کبھی نہیں آئی۔ ایک بار کسی چھوٹی سی افریقی بچی نے مجھ سے پوچھا تھا "کیا مجھ سے ہاتھ ملاؤ گی؟" "ہاں کیوں نہیں" میں نے اس کا ننھا سا ہاتھ تھام لیا تھا۔

اور شاید تب اس کے ہاتھ میں کالے چہروں کی محرومی کے ہزاروں بھید بھی تھے جو وہ چپکے سے میری ہتھیلی کے ساتھ چپکے چھوڑ گئی تھی۔

ریسٹورانٹ میں ملی اس پندرہ سولہ سال کی لڑکی جس کی جلد چمکدار میلانن پر مشتمل تھی موٹے بھرے بھرے ہونٹ اداس آنکھیں جھکی پلکیں، اس عمر میں ہر لڑکی بہت حسین ہوتی ہے بس وہ بھی تھی مگر اس کی گہری اداس آنکھوں میں کوئی پیغام تھا۔ کوئی کوڈ ورڈ جسے ڈی کوڈ کرنے کی ضرورت تھی۔ مجھے وہ نک سک سی بجی ایک عورت کی خادمہ لگ رہی تھی جس کی بھنووں کو اکھاڑ کر بچی شیپ سے ہمکنار کرنے کی کوشش تیز رنگ کی آئی برو پنسل سے کی گئی تھی۔ بھرے آئی میک اپ کے باوجود وہ مادام کوئی بڑا تاثر نہیں چھوڑ رہی تھی۔ مگر اس کم سن لڑکی کی سیاہ آنکھیں کوئی ایسا مقناطیس تھیں جو اپنی طرف کھینچتا تو تھا لیکن ان میں کوئی نظر بھر کر دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔

کچھ آنکھیں اور کچھ کہانیاں دنیا کی نظروں سے ہمیشہ اوجھل ہی رہ جاتی ہیں۔

افغان مہاجر کیمپ میں شربت گل کی آنکھوں کے شرارے اگر کیمرے کی آنکھ نے محفوظ نہ کر لیے ہوتے تو حسرت خودی اور درد میں چھپے راز کیا دنیا تک پہنچ پاتے جو آج بھی راز ہی ہیں۔

درد اور دھتکارے جانے کا کرب کیسے کیسے شاہ پارے ترتیب دے جاتا ہے۔ اگر شربت گل مہاجر کیمپ میں سرخ رنگ کی پھٹی چادر کی بجائے کسی حکمران کے محل میں مراعات پا رہی ہوتی تو کیا اس کی آنکھوں میں وہ شرارے ہوتے؟

شربت گل کی طرح اس کالی سیاہ لڑکی کا چہرہ بھی ایک راز تھا۔ مجھے ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے چاہے جانے کی ایک نظر محبت کی فریاد نظر آئی تھی کہ مجھے دیکھو میرے چہرے پر بھی تو رب کا ہاتھ پھرا ہوا ہے۔

کسی احساس تلے اس نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا، آنکھیں چار ہوئیں تو میں نرمی اور محبت سے مسکرا دی۔ وہ حیران ہوئی پھر نظریں چرا گئی اس کی جلد نے کالے کاغذ پر تفکر کی ایک اجلی تحریر ابھری مگر جب دوبارہ اس نے نظریں قصداً میری طرف کیں شاید وہ جواباً مسکرانا چاہتی تھی تو اس بار ان آنکھوں میں ایک پریشانی سی تھی کہ کہیں اس کے اندر کا خول میرے سامنے ٹوٹ نہ گیا ہو۔

اس کے خول کا بھرم رکھتے ہوئے میں نے نظریں ہٹائیں اور آگے بڑھ کر کھانے کا آرڈر دینے گی۔

سکول، کالج، یونیورسٹی کے طلباء اور ریسرچ سکالرز کے لیے ہماری چند کتب

مضامین پطرس	پطرس	140/- روپے
مضامین فرحت اللہ بیگ	مرتب: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	350/- روپے
جاڑے کی چاندنی	غلام عباس	200/- روپے
مراۃ العروس مع فرہنگ	ڈپٹی نذیر احمد	200/- روپے
اردو تحقیق صورت حال اور تقاضے	ڈاکٹر معین الدین عقیل	700/- روپے
اردو ادب کا ارتقاء	ڈاکٹر وحید قریشی	150/- روپے
اردو تنقید (انتخاب مضامین)	پروفیسر اشتیاق احمد	700/- روپے
اردو غزل (غزل کی دو سو سالہ تاریخ)	ڈاکٹر یوسف حسین خان	800/- روپے
مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	200/- روپے
مقالات اقبال	عبدالواحد معینی	400/- روپے
تنقیدات حسین فراقی	پروفیسر اشتیاق احمد	700 روپے
تنقید اور مجلسی تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	300/- روپے
تحقیق شناسی	ڈاکٹر رفاقت علی شاہد	500/- روپے
اصلاح تلفظ و املاء	طالب ہاشمی	250/- روپے
اردو کے 25 افسانے	ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر	500/- روپے
نیا افسانہ اور قاری	ڈاکٹر طاہر تونسوی	250/- روپے
ولی تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر محمد اشرف خان	250/- روپے
فیض احمد فیض (تنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر طاہر تونسوی	400/- روپے
داستان اقبال	آمنہ صدیقہ	200/- روپے

ناشر: الفقمر انٹرپرائزز، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور 042-37237500

وہ کون تھی

او ہینری / ترجمہ: احمد عدنان طارق، فیصل آباد

کمرہ نمبر 962 کا دروازہ تقریباً شیشے کا بنا ہوا تھا۔ اس دروازے کے ماتھے پر سنہری دھات سے ''جاوید اور نعیم ٹریڈرز اینڈ کمپنی'' کندہ تھا۔ شام کے ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ تمام کلرک کام ختم کر کے دفتر سے گھر جا چکے تھے۔ دفتر کی صفائی کے لئے صفائی والی عورتیں آ چکی تھیں اور اپنا کام کر رہی تھیں۔ ادھر کھلی کھڑکیوں سے گرم ہوا کمرہ نمبر 962 کو گرماتی ہوئی گزر رہی تھی۔

نعیم صاحب پچاس کے پیٹے میں تھے۔ اور خوب موٹے تھے۔ لیکن انہیں شہروں کی رنگینیاں اور گہما گہمی ابھی بھی پسند تھی۔ آج بھی وہ ایک پارٹی میں مدعو تھے جہاں خوب ہلا گلا ہونے والا تھا۔ لیکن جاوید شہر سے کچھ دور مضافات میں رہتا تھا۔

نعیم صاحب بولے: ''آج تو رات کو بھی بڑی گرمی ہوگی۔ جاوید تم بہت خوش قسمت ہو۔ تم اپنے وسیع باغیچے میں بیٹھ کر کسی ٹھنڈے مشروب سے حظ اٹھاؤ گے۔ جب کہ مجھے کھلی فضا میں ہونے والی پارٹی میں گرمی سے نبرد آزما ہونا پڑے گا۔''

حالانکہ نعیم صاحب اتنی تکلیف میں نہیں تھے جتنا وہ ظاہر کر رہے تھے اور یہ بات جاوید بھی بخوبی جانتا تھا۔ جاوید ابھی انیس سال کا تھا۔ جسم کی طرح اس کا چہرہ بھی لمبوترا اور پتلا تھا۔ جس پر ہر وقت سنجیدگی چھائی رہتی تھی۔ اس نے نعیم صاحب کو جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''واقعی عام طور پر شاداب کالونی میں موسم شہر سے اچھا ہوتا ہے۔'' لیکن سردیوں میں وہاں زیادہ سردی بھی ہوتی ہے۔''

تبھی ایک شخص دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا۔ وہ خاموشی سے جاوید کے نزدیک آیا اور نوجوان جاوید کے کان میں جھک کر کھسر پھسر کرنے لگا۔ وہ بولا: ''میں نے پتا چلا لیا ہے۔ وہ کہاں رہتی ہے؟'' وہ شخص جیسے کمرے میں داخل ہوا تھا اور جس طرح اس نے جاوید کے کان میں بات کی۔ حتیٰ کہ اس کے پہنے ہوئے کپڑے بھی اس بات کی چغلی کر رہے تھے کہ وہ کوئی مخبر قسم کی شے تھی۔

جاوید نے اسے ناراضگی سے دیکھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی کوئی راز کی بات نعیم صاحب تک پہنچے۔ لیکن نعیم صاحب نے مخبر کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ وہ دفتر سے جانے کی تیاری میں مصروف تھے۔ وہ بولے: ''اچھا جاوید میں چلتا ہوں۔ شب بخیر۔'' یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد یوں لگا جیسے وہ مخبر عام سا بندہ بن گیا ہو۔ اس نے جیب سے کاپی سے پھٹا ہوا ایک کاغذ نکالا اور جاوید کو دیتے ہوئے بولا ''یہ اس کا پتا ہے۔'' جاوید نے دیکھا کاغذ پر پنسل سے پتا لکھا ہوا تھا ''42۔ غلہ منڈی۔ کمن آباد۔''

مخبر بتانے لگا ''وہ ایک ہفتہ پہلے ہی ادھر رہنے آئی ہے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں اس کا پیچھا کرتا رہوں۔ میں آپ کے لئے چوبیس گھنٹے کام کرنے کو تیار ہوں۔ میں ایک ہزار روپے روز کے لوں گا اور ہر شام کو میں آپ کو مکمل رپورٹ دیا کروں گا۔''

جاوید نے اسے فوراً ہی جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''نہیں نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے صرف اس کے پتے کی ضرورت تھی۔ تمہیں اس کام کی میں کتنی اجرت دوں؟'' مخبر نے جاوید کو کہا۔ ''صرف دو دن کی اجرت۔ یعنی دو ہزار روپے۔'' جاوید نے اجرت مخبر کو دی اور اسے جانے دیا اور پھر خود بھی دفتر سے نکل گیا۔

گاڑی روک کر ایک دفعہ اسے راستہ پوچھنا پڑا اور دوسری دفعہ وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ گاڑی اسے ایک جگہ روک کر پیدل گلیوں میں جانا پڑا۔ یہ شہر میں سب سے غریب علاقہ لگ رہا تھا۔ پوچھتے پوچھتے اسے اپنی مطلوبہ گلی بھی مل گئی۔ مکان بڑے لیکن بہت بوسیدہ تھے۔ کبھی یہاں سفید پوش لوگ رہتے ہوں گے۔ اب یہ مکان اتنے خستہ حال تھے کہ کسی لمحے زمین بوس ہونے کو تیار تھے۔

جاوید نے مکان نمبر 42 بھی ڈھونڈ لیا۔ اسے بہت سے فلیٹوں میں تقسیم کر لیا گیا تھا۔ مکان کے باہر ''نور ہاؤس'' لکھا ہوا تھا۔ آگ سے بچنے کے لئے مکان کے پچھواڑے میں سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ جہاں سے ایمرجنسی میں اترا جا سکتا تھا۔ اب یہ زنگ آلود سیڑھیاں ایسے دکھتی تھیں

جیسے کسی دیہاتی درخت کی شاخیں۔ بھوک کے شکار پیلی رنگتوں والے بچے ان سیڑھیوں پر بے خوف کھیل رہے تھے اور لوگوں نے ان پر کپڑے سکھانے کے لئے پھیلائے ہوئے تھے۔

اور مکینوں کی فہرست بھی گھروں کے باہر بجانے والی گھنٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ جاوید نے گھنٹی بجائی۔ تو دروازہ کھلا۔ جاوید اندر چلا گیا اور اندر بنی ہوئی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ چوتھی منزل پر اس نے نازلی کو دیکھا۔ وہ ایک کھلے دروازے کے باہر کھڑی تھی۔ ایک پر خلوص مسکراہٹ سے اس نے جاوید کو اندر آنے کو کہا۔ اس نے کھڑکی کے ساتھ جاوید کے لئے ایک کرسی رکھ دی۔ اور قریبی کرسی پر خود بھی بیٹھ گئی۔ جاوید نے ادھر ادھر مڑ کر فلیٹ پر برستی غربت کو دیکھا۔ پھر اس نے تیزی سے لیکن محتاط نظروں سے نازلی کو دیکھا۔ اور پھر آخر کار اس سے مخاطب ہوا۔ ''شام بخیر۔ نازلی'' پھر اس نے سوچا۔ ''میں نے اس لڑکی کا انتخاب بالکل صحیح ہی کیا تھا۔ یہ لڑکی ہر لحاظ سے اس انتخاب کے قابل تھی۔'' نازلی قریب میں اکیس برس کی تھی۔ اس کے بال گھنے اور سیاہ تھے اور یوں لگتا تھا ہر بال سے گویا علیحدہ چمک نکل رہی ہو۔ اس کی رنگت میں پیلاہٹ تھی۔ لیکن جلد بہت ملائم تھی اور آنکھیں بڑی اور پلکیں سیاہ تھیں۔ وہ سفید شلوار قمیص میں کسی ہندوستانی ریاست کی شہزادی لگ رہی تھی۔

جاوید کی آنکھوں میں اس کے لئے فکرمندی جھلک رہی تھی وہ بولا۔ ''نازلی! تم نے میرے پچھلے پیغام کا جواب بھی نہیں دیا۔ مجھے تمہیں ڈھونڈتے ایک ہفتہ گذر گیا ہے۔ تم نے پیغام دینے میں اتنی دیر کیوں کی؟ اور اب تم یہاں چھپی بیٹھی ہو۔'' نازلی نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ پھر بولی۔ ''جاوید صاحب! مجھے سمجھ نہیں آتی میں آپ کو کیا جواب دوں۔ آپ نے مجھے بہت ہی خوبصورت اور میری سوچ سے بڑھ کر پیشکش کی ہے۔ کئی دفعہ تو مجھے یوں لگتا ہے کہ میں آپ کے ساتھ رہوں گی تو بہت خوش رہوں گی۔ لیکن پھر مجھے یقین نہیں آتا۔ آپ کو پتا ہے میں پلی بڑھی ہی شہر میں ہوں۔ جاوید صاحب میں کبھی شہر سے باہر نہیں رہی۔''

جاوید نے انتہائی ملائمت لیکن گرم جوش آواز سے اسے کہا۔ ''نازلی میں تو تمہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ تم ویسے ہی رہنا جیسے تم خوش رہ سکو۔ تم چیزیں خریدنے شہر آسکتی ہو۔ تمہارا جب دل چاہے عزیزوں۔ سہیلیوں سے ملنے آجایا کرنا کیا تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے بتاؤ؟

وہ مسکرا کر کہنے لگی۔ ''بھروسہ کیوں نہیں۔ مجھے معلوم ہے آپ کتنے اچھے اور مہربان انسان ہیں۔ مجھے معلوم ہے میں کتنی خوش قسمت ہوں۔ میں نے آپ کے متعلق بہت کچھ سن رکھا ہے۔ مجھے بہت سی باتیں بیگم عارف بھی بتا چکی ہیں۔'' بیگم عارف کا نام سن کر جاوید کی آنکھوں میں چمک آ گئی وہ بولا ''ہاں مجھے وہ شام یاد ہے۔ بیگم عارف میری پڑوسن تھیں۔ ساری شام وہ تمہاری تعریفیں کرتی رہی تھیں اور میں مانتا ہوں ان کی ساری باتیں درست تھیں۔ میں وہ کھانا کبھی نہیں بھول سکتا۔ نازلی! مجھ سے وعدہ کرو تم میرے پاس آؤ گی۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ تمہیں وہاں آکر کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ میں نہیں سمجھتا کسی اور گھر میں تمہیں اس طرح کا ماحول مل سکے گا۔'' یہ باتیں سن کر نازلی افسردگی سے اپنے ہاتھوں کو گھورنے لگی۔ اچانک تبھی ایک انتہائی دکھ دینے والا خیال جاوید کے ذہن میں کلبلایا۔ ''مجھے بتاؤ نازلی! کیا کوئی اور بھی تمہیں بلا تو نہیں رہا۔ سچ بتاؤ۔ کوئی اور تو نہیں؟'' یہ سوال سن کر نازلی کا خوبصورت چہرہ اور گردن سرخ ہو گئی وہ بولی۔ ''جاوید صاحب آپ کو مجھ سے یہ سوال نہیں کرنا چاہئے تھا۔'' اس کی آواز اور نحیف ہو گئی وہ کہنے لگی۔ ''لیکن میں آپ کو بتا دوں۔ واقعی کوئی اور بھی ہے لیکن میں نے اس کے ساتھ ابھی کوئی وعدہ نہیں کیا۔''

جاوید انتہائی سنجیدگی سے بولا: ''کیا نام ہے اس کا۔'' وہ آہستگی سے بولی۔ ''لطیف صاحب'' جاوید چلا کر بولا: ''وہ لطیف برتن والا۔ ایسا شخص تمہیں کیسے جانتا ہے اور پھر میرے جتنے احسانات اس پر ہیں۔ وہ میرا مقابلہ کیسے کرسکتا ہے؟ اسے ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہئے۔'' جاوید کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

نازلی کھڑکی سے نیچے گلی میں دیکھ رہی تھی۔ وہ بولی: ''لطیف صاحب کی کار نیچے گلی میں آکر رکی ہے۔ وہ بھی میرے جواب کے لئے اوپر آرہے ہیں۔ آہ! میں کیا کروں مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے؟''

نیچے سے گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ نازلی نے فلیٹ کا دروازہ کھولا۔ انہوں نے قدموں کی

چاپ سنی۔ کوئی سیڑھیوں سے اوپر آ رہا تھا۔ جاوید تحکمانہ انداز میں بولا ''تم یہیں رکو۔ میں اسے نیچے ہی ملتا ہوں۔''

لطیف صاحب البتہ دو سیڑھیاں اکٹھے پھلانگتے ہوئے اوپر آن پہنچے تھے۔ وہ ہلکے رنگ کی پتلون قمیص میں کوئی ہسپانوی کاروباری شخص لگ رہا تھا اس کے چہرے پر سیاہ داڑھی سج رہی تھی۔ اس کی نظر جاوید پر پڑی تو وہ ایک دم کھڑا ہو گیا اور حیرانی سے جاوید کو دیکھنے لگا۔

جاوید بولا: ''واپس چلے جاؤ۔''

لطیف صاحب بولے: ''السلام علیکم! آپ یہاں کیسے؟'' جاوید نے الفاظ دہراتے ہوئے کہا: ''واپس چلے جاؤ۔ مجھے اس کی ضرورت ہے۔''

لطیف صاحب نے بڑی دیدہ دلیری سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں تو یہاں گھر کے پائپ ٹھیک کروانے کے لئے کاریگر ڈھونڈنے آیا تھا'' جاوید بولا: ''تمہیں یہاں کوئی کاریگر نہیں ملے گا۔ تم واپس چلے جاؤ۔'' لطیف صاحب نے ایک دفعہ جاوید کو عجیب نظروں سے دیکھا اور سیڑھیوں سے نیچے اتر گئے۔ جاوید نازلی کے پاس واپس آ گیا۔ وہ بولا: ''نازلی! مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ تمہیں آ جانا چاہئے میں تمہارا انکار سننا نہیں چاہتا۔ نازلی بولی: ''آپ کب چاہتے ہیں میں آپ کے پاس آؤں۔'' جاوید بولا: ''جتنی جلدی ہو سکے۔''

وہ اس کے سامنے کھڑی تھی اس نے جاوید کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا ''میں نہیں آ سکتی۔ جب تک شگفتہ وہاں ہے۔'' نازلی کی اس بات سے جاوید کے دل کو ٹھیس پہنچی۔ وہ ایک دو قدم پیچھے ہٹا۔ پھر ایک دو قدم آگے بڑھا اور آخر کار بولا: ''تم ٹھیک کہتی ہو۔ شگفتہ کو جانا ہی چاہئے۔ میں اس عورت کو رکھ کر مزید بے آرام نہیں ہو سکتا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ گھر چھوڑ کر چلی جائے گی۔'' نازلی نے پوچھا: ''یہ کام کب تک ہو جائے گا؟''

جاوید نے دانت بھینچ لئے اور پھر بولا: آج رات ہی میں اسے آج ہی گھر سے بھجوا دوں گا۔''

نازلی نے فیصلہ کن انداز میں کہا'' تو پھر میرا جواب ہاں میں ہے۔ آپ جب بھی آئیں گے میں چلنے کے لئے تیار ہوں۔''

اس نے آنکھوں میں بھرپور سچائی سجائے ہوئے جاوید کی آنکھوں میں جھانکا۔ جاوید کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ آخر نازلی اسے مل گئی تھی۔ وہ خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین آدمی تصور کر رہا تھا۔

وہ بولا: ''یہ تمہارا وعدہ ہے کہ تم میرے ساتھ چلو گی۔'' نازلی ملائمت سے بولی: ''ہاں یہ میرا وعدہ ہے۔'' دروازے کی طرف مڑتے ہوئے جاوید نے ایک دفعہ پھر نازلی کی طرف دیکھا وہ اپنی خوش قسمتی پر نازاں تھا۔ وہ بولا ''کل'' نازلی نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔ ''ہاں کل۔''

ایک گھنٹے یا سوا میں جاوید کی گاڑی شاداب کالونی پہنچ گئی اور اب وہ ایک چھوٹے مگر بہت خوبصورت گھر کے باہر کھڑا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور پیدل ہی اپنے خوبصورت اور سرسبز باغیچے میں سیر کرنے لگا تبھی ایک سانولی رنگت والی لیکن انتہائی خوبصورت نازنین دوڑتے ہوئے اسے ملنے آئی اور آتے ہی اپنے دونوں بازو جاوید کے گلے میں حائل کر دیئے اور اٹھلاتے ہوئے بولی: ''امی جان آئی ہوئی ہیں اور انہیں لینے کے لئے بھیا ایک گھنٹے میں آنے والے ہیں وہ کھانا میرے ساتھ کھانے والی تھیں۔ لیکن آخر کھانا کس نے بنانا تھا لہٰذا کھانا نہیں ہے۔'' جاوید تاسف سے بولا: ''اوہو یہ تو بہت زیادتی ہے لیکن میں نے تمہیں کچھ خاص بتانا ہے۔ لیکن مجھے کچھ نہیں آتی کہ میں تم سے یہ بات کیسے کہوں۔ لیکن پھر بھی.....'' وہ تھوڑا سا جھکا اور خوبصورت لڑکی کے کان میں کچھ کہا۔

جسے سن کر خوبصورت لڑکی زور سے چلائی۔ اس کی آواز سن کر اس کی ماں کمرے سے باہر دوڑ کر آئی۔ لڑکی دوبارہ چلا کر بولی۔ ''امی جان! امی جان کیا خوش خبری ہے۔ نازلی واپس آ رہی ہے۔ وہ ہمارے لئے کھانا بنایا کرے گی۔ جب ہم عارف صاحب کے پڑوسی تھے تو وہ ایک سال تک ان کے گھر رہتی تھی اور بیگم عارف کہتی تھیں کہ دنیا میں اس سے اچھا کھانا بناتے ہوئے انہوں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ یہ بتاتے ہوئے لڑکی کی آنکھیں موتیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔

پھر وہ بولی: ''اور جاوید پیارے! اب خود ہی ذرا باورچی خانے میں جاؤ اور شگفتہ کو نوکری سے جواب دے دو۔ اس نے ابھی تک کھانا نہیں بنایا۔ اسے اپنے دودھ پیتے بچے سے فرصت ملے تبھی نا.....''

پروفیسر ارجمند قریشی/ساہیوال

اب چھوڑ کے جاتا ہے گھر سرور عالمؐ
کوئی نہیں اب اس سے مفر، سرور عالمؐ

روضۂ اطہر پر سلام و وداع

کیسے دیکھیں گی اب آنکھیں، رنگ مدینہ نور کا عالم
دل کی دھڑکن مدھم مدھم، آنکھیں میری پرنم پرنم
گنبد خضریٰ جلوہ کناں ہے سارے جہاں کا حسن یہاں ہے
دل میں لیکن درد نہاں ہے، اتھل پتھل، برہم برہم
ساعت رخصت آن کھڑی ہے کیسی مشکل سر پہ پڑی ہے
زخموں پر اب رکھ دو مرہم صلی اللہ علیہ وسلم
در پہ تمہارے آن کھڑا ہوں، میں شاہوں سے کتنا بڑا ہوں
جھولی بھر دو، بھر دو جھولی، آپؐ ہیں منعم میں ہوں منعم
پھر آنے کی آس لگا دو، ان آنکھوں کی پیاس بجھا دو
من میں پریت کی جوت جگا دو، روپ کے داتا سندر پریتم
دے دیجئے سرکارؐ دلاسا، وہ نہ کہیں جاؤں میں پیاسا
آپ کو ہے یہ کام ذرا سا، ساقی کوثر وارث زم زم

نعت نبی کلامؐ

نہ مال و زر ہے، نہ دولت دل، کب آنے کا انتظام ہوگا
نہ جانے قسمت کھلے گی پھر کب، نجانے پھر کب سلام ہوگا
فراق طیبہ میں بہتے آنسو، گہر کی صورت نکل رہے ہیں
ہوں جس کے دامن پہ ایسے موتی وہی تو عالی مقام ہوگا
کسی کے جانے سے دیکھ لینا، یہاں کی رونق نہ ماند ہوگی
سدا ہی میلے لگے رہیں گے، سدا یہاں اژدہام ہوگا
قلم کا رخ پھیر ارجمند اب، خیال آقا میں محو ہو جا
لکھے گا گر نعت شاہ طیبہ ترا زمانے میں نام ہوگا
بروز محشر حضور کوثر سے جام بھر کے پلائیں گے جب
نہ کوئی محروم دید ہوگا، نہ کوئی واں تشنہ کام ہوگا
جہان کے آیا ہے یہاں سوالی نہ جائے گا لے کے جھولی خالی
کبھی نہ آقا نے بات ٹالی، جو آئے گا شاد کام ہوگا

وداع

اب چھوڑ کے جاتا ہے گھر، سرور عالمؐ
کوئی نہیں اب اس سے مفر، سرور عالمؐ
دامن پہ ستاروں کی طرح جلوہ فشاں ہیں
پلکوں سے جو ٹپکے ہیں گہر، سرور عالمؐ
خواہش یہ سجا لایا ہوں سرکارؐ میں در پر
ہر سال ملے اذن سفر، سرور عالمؐ
کیا پاس تھا میرے کہ چلا آیا یہاں تک
آیا ہوں، بانداز دگر، سرور عالمؐ
پھیلائی ہے جھولی، ترے دربار میں شاہا
بھر دے، مجھے مایوس نہ کر سرور عالمؐ
مہمان ہے کس طرح سے خالی یہ چلا جائے
آیا ہے قریشی ترے گھر سرور عالمؐ

نعت

مدینہ آنکھ میں ہوگا تو بینائی نہ کم ہوگی
سکوں ملتا رہے گا اور شکیبائی نہ کم ہوگی
تصور گنبد خضریٰ کا مجھ کو زندہ رکھے گا
کبھی دربار اقدس پر جبیں سائی نہ کم ہوگی
ہر اک مہمان طیبہ کو طلب سے بڑھ کے ملتا ہے
مدینہ جانے والوں کی پذیرائی نہ کم ہوگی
کوئی محروم خواہش، آستانہ پر نہ ٹھہرے گا
مرے مولا کی جانب سے ولا سائی نہ کم ہوگی
وہ اپنے چاہنے والوں کے سر پہ ہاتھ رکھیں گے
اگر جذب دروں ہوگا، شناسائی نہ کم ہوگی
ارادہ ہے کہ پھر اک بار روضہ دیکھ لوں جا کر
وگرنہ قلب آشفتہ کی تنہائی نہ کم ہوگی
لکھوں گا ارجمند احمدؐ، اگر نعت شہ والا
مرا ایمان ہے پھر خامہ فرسائی نہ کم ہوگی

نعت

جو حرم گنبد کی ٹھنڈی چھاؤں میں
شہر میں دیکھا نہ میں نے گاؤں میں
پیار، الفت، دلستانی، دلبری
سب ملا ہے مجھ کو ان کے ناؤں میں
جو محبت آپؐ نے سرکار دی
باپ میں دیکھی نہ میں نے ماؤں میں
میرے بیٹے، بیٹیوں پہ ہو کرم
آ گئے ہیں ہم، کرم فرماؤں میں
دوسروں کی ٹھوکروں میں اب نہ ڈال
آ پڑا ہوں سائیں، تیرے پاؤں میں
طالب امداد ہے اب ارجمند
پڑ گیا ہے مشکلوں، کٹھناؤں میں

محمود غزنی / بورے والا

بعض اوقات تو چھوٹی سی کسی لغزش پر
لوگ خارج ہمیں ایمان سے کر دیتے ہیں

تیرا سلوک جو ظالم سماج جیسا ہے
مجھے تو یہ تیرا تحفہ بھی تاج جیسا ہے
لگا ہے تو پھر مجھ سے ملنے مت آنا
مرا لباس مرے کام، کاج جیسا ہے
یہاں بھی لوگ سسکتے سنائی دیتے ہیں
یہاں کا راج بھی دشمن کے راج جیسا ہے
امیر شہر کو پھر کیوں نہیں خبر اس کی
مرا سکوت اگر احتجاج جیسا ہے
یہی بہت ہے کہ تو حال پوچھنے آیا
ترا تو لفظ بھی خوں کے خراج جیسا ہے
اب اس کے حال پہ آنکھوں میں یہ نمی کیسی
ترے سبب سے ہے یہ شخص آج جیسا ہے
اسے بھی موت کا عفریت آ کے نگلے گا
بدن زمین سے اگتے اناج جیسا ہے
لیا نہیں ہے کسی نے بھی جیسے دل اپنا
کسی غریب کی بیٹی کے داج جیسا ہے
بدلتا رہتا ہے پل پل گھڑی گھڑی غزنی
مزاج شہر بھی اس کے مزاج جیسا ہے

جسے دیکھو وہی فاقہ کشی سے مرنے والا ہے
بڑے عہدے پہ فائز شخص اب کیا کرنے والا ہے
نمایاں ہیں نقوش غم تو اب افسردگی کیسی
مری تصویر میں تو رنگ سارے بھرنے والا ہے
بڑا شاطر ہے اس میں بھی یقیناً سرخرو ہوگا
جو میرے قتل کا الزام مجھ پہ دھرنے والا ہے
مجھے جذبوں سے خالی بستیاں اچھی نہیں لگتیں
نہ کوئی جینے والا ہے نہ کوئی مرنے والا ہے
تو شاعر ہو کے اتنی دور رہتا ہے محبت سے
یہی تو کام ہے جو سب سے پہلے کرنے والا ہے

بہت ہے بھیڑ بازار سیاست کی دکانوں پر
یہاں بیٹھا ہوا ہر شخص جیبیں بھرنے والا ہے
وہاں جا کر زیادہ گفتگو کو طول مت دینا
یہی کہنا کوئی محمود ہے جو مرنے والا ہے
مرے گاؤں میں آئی ہیں بہت تبدیلیاں غزنی
جو اک تالاب تھا سارا لہو سے بھرنے والا ہے

نہ چھت کسی کوئی دیوار و در بھی ہے کہ نہیں
ہوا سے پوچھتے ہیں اس کا گھر بھی ہے کہ نہیں
زمیں تو آگ بنائی ہوئی ہے بندوں نے
وجود امن ترے چاند پر بھی ہے کہ نہیں
میں شہر والوں کے اک ایک دکھ پہ رویا ہوں
مرے غموں پہ کوئی آنکھ تر بھی ہے کہ نہیں
ترا تو رزق بھی دشمن کے گھر سے آتا ہے
ترے بدن پہ ترا اپنا سر بھی ہے کہ نہیں
یہ باپ کا ہے، یہ شوہر کا ہے، یہ بیٹے کا
زمیں پہ کیا کوئی عورت کا گھر بھی ہے کہ نہیں
سنا ہے باغ میں کل شام تک تو چرچا تھا
گلاب آج کسی شاخ پر بھی ہے کہ نہیں
جو چارہ گر ہیں وہ اک دوسرے سے پوچھتے ہیں
یہ بدنصیب یہاں رات بھر بھی ہے کہ نہیں
چلے ہو جانب ملک عدم خوشی سے
کفن کی جیب میں رخت سفر بھی ہے کہ نہیں
پڑا ہوا ہے جنازہ گلی میں غزنی کا
پتا کرو اسے اس کی خبر بھی ہے کہ نہیں

حکمرانوں سے کہاں لعل و گہر مانگتی ہے
خلقت شہر تو اک لقمۂ تر مانگتی ہے
ایسا پہلے تو نہیں تھا مری بستی میں کبھی
اک بلا روز کسی شخص کا سر مانگتی ہے

اک بھکاری کی طرح ہاتھ میں کشکول لیے
رات، تھک ہار کے سورج سے سحر مانگتی ہے
تو مجھے کب غم فرقت سے رہائی دے گا
اتنے عرصے میں تو دیوار بھی در مانگتی ہے
فاختہ سادہ و معصوم ہے، دیوانی ہے
اپنے صیاد سے کاٹے ہوئے پر مانگتی ہے
ایک بیوہ سے بھی اس شہر کی شاہی اب تو
کام کرنے کے عوض تحفۂ زر مانگتی ہے
خلقت شہر سزا پاتی ہے چوراہے پر
بات کرنے کی اجازت بھی اگر مانگتی ہے
ایک پیسہ بھی نہیں جیب میں اپنی غزنی
زندگی ہے کہ کسی چاند پہ گھر مانگتی ہے

دشمنی دل سے، جفا جان سے کر دیتے ہیں
بات کچی ہے تو دیوان سے کر دیتے ہیں
بعض اوقات تو چھوٹی سی کسی لغزش پر
لوگ خارج ہمیں ایمان سے کر دیتے ہیں
مجھ کو مرنا ہے کہ کچھ روز ابھی جینا ہے
فیصلہ ایک ہی مسکان سے کر دیتے ہیں
بیٹیوں، بہنوں کے حصے کی زمیں خود لے کر
شادیاں آج بھی قرآن سے کر دیتے ہیں
غم نہیں ماؤں کو پردیس گئے بیٹوں کا
خوش بہت قیمتی سامان سے کر دیتے ہیں
حکم تیرا ہے تو اک دن کی بھی کیوں دیر کریں
ہم تجھے آج جدا جان سے کر دیتے ہیں
لفظ جو بھی تیرے خفگی کا سبب بنتا ہے
حذف وہ آج ہی دیوان سے کر دیتے ہیں
شاعروں کو کوئی کیسا بھی کہے پر غزنی
باخبر پہلے ہی طوفان سے کر دیتے ہیں

خلیل فاروقی / لاہور

تنہا ہوا تو بڑھ گیا خاموشیوں کا شور
خالی مکان کے در و دیوار چیخ اٹھے

جہاں بھی جب بھی آیا ہوں میں باحسن کمال آیا
عروج وقت کے ماتھے پہ میں بن کر جمال آیا
خودی کی صاف چادر پر جو ہلکا سا نشاں ڈالیں
امیر شہر کے منہ پر وہ سکے میں اچھال آیا
اجالا ہی اجالا ہے مرے چاروں طرف اب تو
کہ اپنے پورے پیکر کو میں سورج میں ہی ڈھال آیا
مجھے تو دید کے منظر سے بڑھ کر ہے تڑپ تیری
دعا جب ہجر کی مانگی تو قسمت میں وصال آیا
خلیل عصر تو باطل کی آتش سب بجھا دے گا
تو ہر نمرود سے کہہ دو کہ اب وقت زوال آیا

کون کتنا باوفا ہے سب ہی پرکھے جائیں گے
بے ثمر اشجار سارے جڑ سے کاٹے جائیں گے
دست گل چیں گلستاں میں کارگر نہ ہو کبھی
اگلی نسلوں تک وگرنہ صرف کانٹے جائیں گے
اب مقابل تیرگی کے روشنی ہو گی یہاں
اب زمیں پر بھی نئے سورج تراشے جائیں گے
چل رہی ہے چار سو اب تو ہوائے مضطرب
اب سکون دل کی خاطر شور ڈالے جائیں گے
کیوں سفر کی منزلوں میں راہنما کی ہو طلب
ولولے ہی اب امیر جہد مانے جائیں گے
راہنما ہی جب یہاں پر کارواں کو بیچ دیں
قافلے تو پھر سر آغاز لوٹے جائیں گے
کیا گل و گلزار ہوگی پھر خزاں کی آگ بار؟
جب خلیل وقت بھی آتش میں ڈالے جائیں گے
کہا سب نے حقائق کو عیاں رکھا ہوا ہے

بتاتے بھی نہیں ان کو کہاں رکھا ہوا ہے
بظاہر تو فقیر بے نوا بن کر رہے ہیں
مگر باطن کبھی نے ہی نہاں رکھا ہوا ہے
بھکاری مانگتا بھی ہے تو اب ایسی امداد سے
ترازو جانتا ہوں میں جہاں رکھا ہوا ہے
کبھی مدھم نہیں ہوگا تری یادوں کا سورج
تری یادوں کے سورج کو جہاں رکھا ہوا ہے
ترے سب خط تحائف اور بھی کچھ جو ملا ہے
محبت سے مرے گھر جان جاں رکھا ہوا ہے
جو ہم چپ ہیں ابھی تک برملا مقصد یہی ہے
کہ خاموشی میں بھی اپنی بیاں رکھا ہوا ہے
خلیل مضطرب کا یہ وطیرہ ہے جہاں میں
کہ اس نے برکس پر سب عیاں رکھا ہوا ہے

ہم اس کنارے اور وہ اس پار چیخ اٹھے
دریا شدید پیاس سے اس بار چیخ اٹھے
تنہا ہوا تو بڑھ گیا خاموشیوں کا شور
خالی مکان کے در و دیوار چیخ اٹھے
کچھ اس طرح سے لپٹا ہے قدموں سے راستہ
ہر ایک سنگ میل پہ رہوار چیخ اٹھے
ہو اس طرح سے کاوش بیداری شعور
چپ ہے ابھی جو صاحب کردار چیخ اٹھے
ٹھہرے ہوئے خیال کے دریا میں اب خلیل
کنکر تو وہ اچھال کے منجدھار چیخ اٹھے
فکر و نظر میں ایسے سمالیں کے آفتاب
اپنے وجود کو بھی بنالیں کے آفتاب

ہم سے رہے گی کب تلک یہ دور روشنی
شعروں کے لفظ لفظ میں ڈھالیں گے آفتاب
اب روشنی میں روشنی پھیلے گی چار سو
نوک قلم سے ہم تو نکالیں گے آفتاب
اک آفتاب کم ہے کہ دے سب کو روشنی
ان بستیوں میں اور اجالیں گے آفتاب
اس روشنی کی جب بھی جہاں میں کمی ہوئی
کشت ادب میں اور اگالیں گے آفتاب
لیں گے خلیل اب تو اندھیرا بھگا کے دم
ظلمت کی وادیوں میں اچھالیں گے آفتاب

آفتاب خان / لاہور

تخت شاہی چھوڑ کر جب میں اکیلا چل دیا
اس بغاوت کے صلے میں خوب رب نے پھل دیا
تحفہ درویش لے کر لوگ خوش ہیں اس لیے
اک ذرا سی چیز نے سب مشکلوں کا حل دیا
اب پرندے کن درختوں پر بنائیں گھونسلے
شہر والوں نے ہمیشہ دوسروں کو قتل دیا
عشق کے معیار پر پورا اترتے ہو تمہیں
ہر قدم ہر موڑ پر میں نے تمہیں پل پل دیا
اس نے میرے ہاتھ چھوے میں نے چھوے اس کے گال
عشق نے یوں حسن کے چہرے پہ غازہ مل دیا
میرے دل کی سرزمیں پر، پھر سے اترا ابر شگال
اور آنکھوں کے کٹوروں کو مسلسل جل دیا
کھڑکیاں سب کھول دو اب سامنے ہے آفتاب
سرد موسم میں اسی نے دھوپ کا بادل دیا

سعید اقبال سعدی / گوجرانوالہ

بظاہر آسماں کا فاصلہ ہے
ہمارے قلب کے اندر خدا ہے
بہت چالیں چلی ہیں دشمنوں نے
پیالی میں ذرا طوفاں اٹھا ہے
سمجھنے میں مجھے کچھ پل لگے ہیں
لڑائی میں ہر اک حربہ روا ہے
وہی میرے سہارے پر کھڑا تھا
وہی میرے مقابل آ گیا ہے
نئی کو کیوں برا کہنے لگی ہے
پرانی نسل کو کیا ہو گیا ہے
محبت میں ذرا محتاط رہنا
زمانہ سازشیں کرنے لگا ہے
سنیں گے چار سو سب لوگ اس کو
ہوا کے دوش پر میری صدا ہے
مرے دم سے اسے شہرت ملی ہے
مرا دشمن مرے ہاتھوں بنا ہے
مٹا سکتے نہیں سعدی تمہیں وہ
تمہارے دشمنوں کو بھی پتہ ہے

شجر پر کب اسے کندہ کیا ہے
تمہارے نام کو دل پر لکھا ہے
سزا دیجے محبت سے مجھے اب
محبت ہی اگر میری خطا ہے
تمہارا شہر جنت کی طرح ہے
تمہاری لو مجھے باد صبا ہے
یہی ہے پیار کا انجام شاید
ہمارے ساتھ بھی جو ہو رہا ہے

ملیں اب کس طرح بے چین روحیں
دلوں کے بیچ دیوار انا ہے
تجھے بھی پیار ہو جائے کسی سے
مرے دشمن تجھے میری دعا ہے
بچا اس سے خوشی کے دیپ سعدی
بہت بپھری ہوئی غم کی ہوا ہے

کیا ہے غور تو مجھ پر کھلا ہے
وفا کے روپ میں ہی اب دغا ہے
لگا تھا جو بڑا ہمدرد مجھ کو
وہ لمحہ لوٹ کر چلتا بنا ہے
جسے ڈر لگ رہا تھا ظلمتوں سے
وہی انسان جگنو بن گیا ہے
مجھے اب درگزر کرنا پڑے گا
عدو سر کو جھکا کر آ گیا ہے
محبت دستکیں دینے لگی تھی
دریچہ قلب کا خود ہی کھلا ہے
تیری مشتاق تھیں ترچھی نگاہیں
نشانہ ٹھیک دل پر ہی لگا ہے
ترے دل میں کھلیں گے پھول سعدی
وفا پر موسم گل آ رہا ہے

ہوس نے اس قدر بھوکا کیا ہے
بشر اپنا بدن کھانے لگا ہے
دلوں میں جو چراغ انسیت تھا
ہوس کی آندھیوں سے بجھ رہا ہے
محبت مر گئی لیکن لحد پر
دیا جلتا رہے میری دعا ہے

ہزاروں خواہشیں گوندھی گئی ہیں
عجب مٹی سے میرا دل بنا ہے
مرے دریا اسی میں گر رہے ہیں
سمندر کس لیے روٹھا ہوا ہے
محبت کے لیے دنیا بنی تھی
زمانہ نفرتوں میں گھر گیا ہے
مسیحا! تو سمجھ سکتا نہیں کچھ
دلوں کو کس طرح غم کھا گیا ہے
بڑا مکار ہے دشمن وفا کا
دلوں کے ساتھ سازش کر رہا ہے
تمہارے پاس کیا رکھا ہے سعدی
تمہارے پاس بس جھوٹی انا ہے

بلا کی آندھیوں میں جل رہا ہے
دیا جس کو خدا کا آسرا ہے
دھڑکتا ہے ہزاروں زخم سہہ کر
ذرا سے قلب میں کیا حوصلہ ہے
دعائیں مانگ کر دیکھو خدا سے
دعاؤں کا خدا سے رابطہ ہے
کہاں اُمید تھی تم سے ملوں گا
ترا ملنا یقیناً معجزہ ہے
پرانے یار ہیں اک دوسرے کے
وصال اور ہجر میں کب فاصلہ ہے
کرے گا عاشقوں کی قدر وہ ہی
کسی کی چاہ میں جو جلا ہے
بڑھاتی ہے بشر کی خودسری کو
انا اب ہر بشر کا مسئلہ ہے

طارق چغتائی/لاہور

یہی بس اس کا شجرہ ہے یہی نام ونسب اس کا
یہی اس کا حوالہ ہے محبت بس محبت ہے

رات بھر ساتھ رہیں چاند دیا اور جگنو
میرے ہم راہ چلیں چاند دیا اور جگنو
رنگ خوں رنگ بنیں قوس قزح کی صورت
سات رنگوں سے سجیں چاند دیا اور جگنو
جانے کس وقت بدل جائے مزاج موسم
کب جلیں اور بجھیں چاند دیا اور جگنو
جب بھی غفلت کی کبھی نیند مجھے آتی ہے
مجھ کو بے دار کریں چاند دیا اور جگنو
صبح امید کی خواہش میں شب تار کے بیچ
کتنے حصوں میں بٹیں چاند دیا اور جگنو
ایک مدت سے اسی کوشش پیہم میں ہے
تیرے پیکر میں ڈھلیں چاند دیا اور جگنو
میں بھی ہر روز یہ دیتا ہوں دعائیں ان کو
خضر کی عمر جئیں چاند دیا اور جگنو

میز پہ ایسے الٹے پڑے ہیں کاغذ اور قلم
جیسے مجھ سے روٹھ گئے ہیں کاغذ اور قلم
آتے آتے لوٹ آیا ہے ایک حسین خیال
لگتے لگتے ہاتھ لگے ہیں کاغذ اور قلم
جب بھی تجھ سے ہٹ کر لکھا میں نے حرف کوئی
دونوں اکثر چیخ اٹھے ہیں کاغذ اور قلم
اس کے بعد شکست نہ کھائی میں نے دنیا سے
جب سے میری ڈھال بنے ہیں کاغذ اور قلم
جیسے مجھ میں جاگ پڑی ہے سوئی اک تحریر
جیسے مجھ میں ناچ اٹھے ہیں کاغذ اور قلم
اس کے نقش مٹا نہیں سکتا وقت قیامت تک
جس کی قسمت میں لکھے ہیں کاغذ اور قلم
جیسے طارق لفظ میں ڈھالا اپنی ہستی کو
قریہ قریہ ڈھونڈ رہے ہیں کاغذ اور قلم

جب پردیسی ہو جاتے ہیں گھر دروازے گلیاں
شدت سے پھر یاد آتے ہیں گھر دروازے گلیاں
جینے کا احساس دلاتے ہیں یہ کیسے کیسے
کیا کیا خون کو گرماتے ہیں گھر دروازے گلیاں
خاک سے بھی کم تر ہو جاتا ہے وہ اس دنیا میں
جس انسان سے کھو جاتے ہیں گھر دروازے گلیاں
ان جیسا خوش قسمت کوئی اور بھلا کب ہوگا
اپنے قرب میں جو پاتے ہیں گھر دروازے گلیاں
کھلی فضا میں آزادی کے کیسے کیسے نغمے
مل کے ساتھ مرے گاتے ہیں گھر دروازے گلیاں
صورت گل رکھتے ہیں تازہ ہر موسم ہر رت میں
شاخ بدن کو مہکاتے ہیں گھر دروازے گلیاں
جب بھی طارق مزدوری سے میں لوٹوں، وہ ان میں
کیسا چین سکوں لاتے ہیں گھر دروازے گلیاں

ازل تک ہم نے دیکھا ہے محبت بس محبت ہے
کئی رنگوں سے پرکھا ہے محبت بس محبت ہے
حوالے جس قدر دیکھے مثالیں جس قدر ڈھونڈیں
نتیجہ ایک نکلا ہے محبت بس محبت ہے
یہی بس اس کا شجرہ ہے یہی نام ونسب اس کا
یہی اس کا حوالہ ہے محبت بس محبت ہے
محبت بس محبت ہے زمانہ کل بھی کہتا تھا
زمانہ اب بھی کہتا ہے محبت بس محبت ہے
اسے جب بھی بدلنے کی کروں کوشش، کوئی مجھ میں
ہمیشہ بول پڑتا ہے محبت بس محبت ہے
وہ جس میں تذکرہ تیرے لب و رخسار کا لکھا
وہی اک شعر اچھا ہے محبت بس محبت ہے
سواد عشق میں ہم نے سدا پتھر کی سل کو بھی
سراپا موم دیکھا ہے محبت بس محبت ہے
مجھے گم راہ کرتی ہیں مری سوچیں جہاں طارق
تصور چیخ اٹھتا ہے محبت بس محبت ہے

نعت

کیوں نہ اس کے در سے مانگے یہ گدائے بے نوا
شافع محشر جو ہے اور ہے حبیب کبریا
کوثر و تسنیم سے پہلے اگر کر لے وضو
پھر کرے وہ مدحت سرکار و شاہ انبیاء
خالق کونین نے بھیجا تو یہ رتبے دیے
رحمت اللعالمیں، ختم رسل شاہ ہدیٰ
ملجا و ماویٰ وہی ہیں رحمت عالم وہی
جن کی خاطر رب عالم نے بنائے دوسرا
جس کے در پر رات دن سجدے میں ہیں حور و ملک
اس کے دم سے ہے مہ و خورشید و انجم میں ضیا
کاش انجم کو زیارت ہو مدینے کی نصیب
جانے کب سے ہے مرے دل میں یہی اک مدعا

دولت علی انجم/ساہیوال

اقرار مصطفیٰ/لاہور

اپنی آنکھوں کو بھی کہہ کے سلا دیتا ہوں
اپنی اوقات سے بڑھ کر نہیں دیکھا جاتا

طے کرلیا ہے اشک ستارا بناؤں گا
ورنہ میں چاند کو بھی غبارہ بناؤں گا
اب تک مرا وجود تو میرا وجود ہے
اک دن بھی وجود تمہارا بناؤں گا
جو رہ گیا ادھورا وہی نقش ایک دن
میں جا کے آسمان پہ سارا بناؤں گا
کیسا لگوں گا خود کو بھی سوچتا ہوں میں
جس جس نے مجھ کو جو ہے پکارا بناؤں گا
کاغذ کی کشتیاں تو بناتے ہیں سب مگر
میں کاغذوں سے آج کنارا بناؤں گا
پرکار جاں سے دائرے کھینچوں گا جب بھی
ان دائروں میں چہرہ تمہارا بناؤں گا
یہ بھی کسے خبر تھی کہ اقرار ایک دن
اپنے لیے میں تم کو سہارا بناؤں گا

یہ کیسا رابطہ رکھا گیا ہے
مجھے خود سے جدا رکھا گیا ہے
زمانے کی ہواؤں کے مقابل
جلا کر اک دیا رکھا گیا ہے
رگ جاں سے بھی ہے نزدیک لیکن
غضب کا فاصلہ رکھا گیا ہے
اُمیدوں کے بھی در بند کرکے
در امکاں کھلا رکھا گیا ہے
جہاں دم توڑ دیتی ہے تمنا
وہیں دست دعا رکھا گیا ہے
جہاں دیوار ہے اک راستے میں
وہیں اک راستا رکھا گیا ہے

کوئی تو بات ہے جس کی بدولت
خلا اندر خلا رکھا گیا ہے
عجب عالم ہے یہ بھی آئنے کے
برابر آئنہ رکھا گیا ہے
محبت کے بڑے دعوے ہیں اقرار
تعلق نام کا رکھا گیا ہے

سربریدہ کوئی لشکر نہیں دیکھا جاتا
ہم سے یہ ظلم کا منظر نہیں دیکھا جاتا
اپنی آنکھوں کو بھی کہہ کے سلا دیتا ہوں
اپنی اوقات سے بڑھ کر نہیں دیکھا جاتا
اپنے کاندھوں پہ اٹھا لیتا ہوں لاشہ اپنا
بوجھ اپنا کسی سر پر، نہیں دیکھا جاتا!
دیکھنے کو تو اسے یار نہیں ہے مجھ کو
بات یہ ہے کہ برابر نہیں دیکھا جاتا
لوٹنا ہو تو ان آنکھوں سے کنارا کرلو
ڈوبنا ہو تو سمندر نہیں دیکھا جاتا
آئنہ ہوں نہ چرا مجھ سے تو نظریں اپنی
دیکھ آئینے سے باہر، نہیں دیکھا جاتا
ہم برے ہیں تو کوئی بات نہیں ہے اقرار
ان سے کوئی بھی سخن ور نہیں دیکھا جاتا

ہر گھڑی عافیت، ہر گھڑی شکریہ
حاصل زندگی، آگہی، شکریہ
مجھ کو مر کر بھی اک زندگی مل گئی
دوستوں کو دعا، شاعری، شکریہ
گھر کی دیوار باتیں سمجھنے لگی
اب ضرورت نہیں آپ کی، شکریہ

فکر دنیا و دیں اب نہ الجھا مجھے
آخری درگزر، آخری، شکریہ
ہو چلا ہے یقیں گلستاں ہے مرا
پھول، خوشبو، صبا، چاندنی، شکریہ
در مقفل ہوئے، چلمنیں گر گئیں
ایک کھڑکی کھلی رہ گئی، شکریہ
ڈھونڈ لایا ہوں اقرار پاتال سے
ایک قوس قزح، روشنی شکریہ

حقیقت پہ یہ بھی واقعہ ہے
محبت ابتدا ہے انتہا ہے
نہ کیوں پہچان پایا میری صورت
اگر شفاف تیرا آئنہ ہے
اسی اک سوچ میں ڈوبا ہوا ہوں
مجھے تیرا کہ اپنا سامنا ہے
نظر آنے لگی جب دل کی حالت
کھلا پھر یہ محبت اک بلا ہے
ضرورت اور پھر اتنی ضرورت
بتانے کی ضرورت ہی یہ کیا ہے
وجود ذات سے انکار کیسا
اسے دیکھا ہوا پرکھا ہوا ہے
درون خانۂ دل کچھ نہیں تو
برون خانۂ دل کیا پڑا ہے؟
ترے اندر سے میں واقف نہیں ہوں
مرے اندر مگر میرا خدا ہے
عناصر تو اکٹھے کر دیے تھے
یہ کیا اقرار سب بکھرا پڑا ہے

عقیل عباس/منڈی بہاؤالدین

کشتی میں اُتاری تھی قبا شام نے اپنی
یوں آنکھ سے اوجھل ہوئے کچھ اور کنارے

چلا ہے منہدم ہونے کہیں سے
مکاں روٹھا ہوا اپنے مکیں سے
سپردِ خاک بھی کر ہو گئے تو
اگ آئیں گے شجر بن کر زمیں سے
بچا کر بال و پر ہی لا سکے ہیں
حدودِ گوشہ مسند نشیں سے
جو لاوا پک رہا تھا پھٹ گیا تو
دھواں اٹھنے لگا میری جبیں سے
تمہارے لب کی دستک سے اٹھا تھا
میں اپنے خواب کے تختِ بریں سے

صرصر کا تقول ہے کہ ہونے میں شرارے
ٹیلوں سے ادھر کوئی مرا نام پکارے
لہجوں میں وہ گرمی ہے کہ جل جائے تکلم
آنسو ہیں کہ ٹوٹے ہوئے مجذوب ستارے
لے جائے گا کپڑوں کی طرح سب کو اڑا کر
رستے میں وہ طوفان کھڑا ہوگا ہمارے
فنکار تو وہ اتنا بڑا ہے کہ جو چاہے
ناکے سے بھی سوئی کے پکڑ اونٹ گزارے
کشتی میں اتاری تھی قبا شام نے اپنی
یوں آنکھ سے اوجھل ہوئے کچھ اور کنارے

دیکھ کر سورج کے تیور چل دیا
تیرگی کا سارا لشکر چل دیا
وقت کی میعاد پوری ہو گئی
وقت اپنی چھب دکھا کر چل دیا
دیکھ کر سورج کو خوں میں لوٹتا
اک پرندہ سہم کر گھر چل دیا
حلقۂ احباب سے اٹھا تو میں
تیرے کوچے کو ستمگر چل دیا
تم کو میری ذات سے تنگی نہ ہو
کہہ کے دیواروں سے یہ در چل دیا

افتاد تو یہ مجھ کو پڑی ہے کہ بلا ہے
تنہائی کا آسیب مرے پیچھے پڑا ہے
اس شہرِ خدا داد کی مرطوب فضا میں
ہر شخص زمیں بیچ کے معتوب ہوا ہے
کونپل کسی خواہش کی نمو پانے لگی ہے
دیوار کے اندر سے کوئی پیڑ اگا ہے
ہے قیس کی ہی روح پسِ پشت ہوا کے
طوفان کسی ریت کے ٹیلے سے اٹھا ہے
ہم نے بھی اسے سامنے پا کر دلِ بوجھل
مشتاق ہیں بیزار ہیں کیا کیا نہ کہا ہے

یوں جو میں خاموش کھڑا ہوں
تم یہ سمجھو بھید بھرا ہوں
جا سکتی ہو چھوڑ کے مجھ کو
ویسے بھی میں سخت بڑا ہوں

یہ جو اک دیوار اٹھی ہے
میں کتنا تقسیم ہوا ہوں
اب تو کوئی بات کرے گی
اس کا رستہ روک کھڑا ہوا
ایسی کوئی بات نہیں ہے
یونہی دریا دیکھ رہا ہوں
ایسی ہی اک فلم بنا ہے
پچھلے ہفتے دیکھ چکا ہوں
لوگو میں نے غور کیا ہے
تو گویا سقراط ہوا ہوں

دامنِ دل
(شعری مجموعہ) اقبال بالم
صفحات:178 قیمت: 400روپے
ناشر: اُردو سخن آرٹ لینڈ

وہ ایک شخص
(شعری مجموعہ) حسن عسکری کاظمی
وہ ایک شخص جو دل میں سما گیا تھا حسنؔ
اُسی کا رہتا ہے ہر لحظہ انتظار مجھے
صفحات:160 قیمت: 300روپے
ناشر: اظہار سنز،19اُردو بازار، لاہور

خالق آرزو/ساہیوال

پھر یوں ہوا کہ دونوں کے دل دکھ سے بھر گئے
دریا جو چاہتوں کے چڑھے تھے اتر گئے

خوف پھر بھی، ہراس پھر بھی ہے
تو بھی ہے دل اداس پھر بھی ہے
جسم پر پیرہن تو ہے لیکن
آدمی بے لباس پھر بھی ہے
بہہ رہا ہے فرات شہر کے ساتھ
میرے ہونٹوں پہ پیاس پھر بھی ہے
یاس کی سرحدوں کو آ پہنچے
اس کے ملنے کی آس پھر بھی ہے
چھو کر دل دکھا دیا اس کو
وہ کہ غم ناشناس پھر بھی ہے
اس کی خوشبو کہ لے اڑی تھی ہوا
کیوں مرے آس پاس پھر بھی ہے
میں نکل کر بھی آ گیا خالق
سارا منظر اداس پھر بھی ہے

کاش زندگی اپنی مختصر نہیں ہوتی
ان کی بے وفائی بھی اپنے سر نہیں ہوتی
یہ تو بس خدا جانے کیوں نہ آئے وہ آخر
رات کی تمنا تھی اب سحر نہیں ہوتی
کچھ تو ہے سبب اس کا جو نہ لب کھلے اپنے
ورنہ ہر دعا اپنی بے اثر نہیں ہوتی!
زخم بار ہا ہم نے دوستوں لیے دل پر
وہ جو کل عنایت تھی اب ادھر نہیں ہوتی
ٹوٹ جائیں گے رشتے دوستو! عزیزوں سے!
زندگی کسی کی بھی ہم سفر نہیں ہوتی!

کوئی ایسا بہانہ چاہتا ہوں
تجھے میں بھول جانا چاہتا ہوں
شکستہ ہوں مگر گرنے سے پہلے
سہارے آزمانا چاہتا ہوں
ستارہ تیری پیشانی پہ رکھ کر
نیا سورج اگانا چاہتا ہوں

خلا میں دور تک جانے کی ضد ہے
ہوا کے پر چرانا چاہتا ہوں
کھٹکتی ہے صبا کی سرسراہٹ
چمن سے دور جانا چاہتا ہوں

پھر یوں ہوا کہ دونوں کے دل دکھ سے بھر گئے
دریا جو چاہتوں کے چڑھے تھے اتر گئے
اس کو جو خط لکھے تو فقط یہ دیا جواب
دیوانگی کے ساتھ موسم گزر گئے
ویسے تو ایک دوجے کو پانے کی دھن بھی تھی
لیکن جہاں کی رسموں کو دیکھا تو ڈر گئے
ہر بات میں مزہ وہ کہاں شعر گوئی کا
تم سے بچھڑ کے اپنے تو یہ بھی ہنر گئے
اس کے ہر ایک درد کو جھومر بنا لیا
خالق سنگھار کرکے کچھ ایسے سنور گئے

کون ایسا حصار توڑے گا
جب ہیں دشمن کے چار سو دشمن
ممتاز شاعرہ انمول گوہر کا چوتھا شعری مجموعہ
ہم نے لفظوں میں زندگی رکھ دی
مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہوگیا ہے
صفحات: 176 قیمت: 400روپے
نستعلیق پبلی کیشنز
F-3 غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور 0300-4489310

تجسس رہا اس سے مل کر ہمیشہ
مرے بارے میں اور کیا جانتا ہے
معروف شاعر خالد مسعود کا پہلا شعری مجموعہ
رعنائی
مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہوگیا ہے
صفحات: 128 قیمت: 300روپے
نستعلیق پبلی کیشنز
F-3 غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور 0300-4489310

بقیہ انٹرویو کیپٹن (ر) عطا محمد خان

آتا تھا۔

نگاہ برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

انہوں نے ہی مجھے اردو کے ابتدائی عروض سکھائے۔ دوسرے استاد ماسٹر غلام محمد صاحب تھے جن کا ذکر ابھی کر چکا ہوں۔ پھر زندگی کے دوسرے موڑ میں زرعی یونی ورسٹی فیصل آباد سے زراعت میں بی ایس سی کی ڈگری لی۔ پنجاب یونی ورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا۔ مجھے شیلے اور ایلیٹ بہت پسند تھے۔

ارژنگ: پہلے فوج اور بعد ازاں سول بیوروکریسی ایسے عالم میں شاعری سے رغبت اور ذریعہ اظہار بنانا منفرد بات لگتی ہے یہ متضاد شعبہ جات، اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

عطا محمد خان: فوج اور سول بیوروکریسی نے زندگی میں نظم و ضبط پیدا کرنے کا ہنر سکھایا ہے۔ شاعری سے رغبت اور اسے ذریعہٗ اظہار بنانا میرے اندر کے عطا کی مجبوری تھی۔ ذریعہٗ معاش کچھ بھی ہو مجھے شاعر ہی بننا تھا اور میں شاعر ہی بنا ہوں۔ گھر کا ماحول، سکول کا زمانہ، انگریزی ادب کا مطالعہ، ان سارے عوامل نے مجھ پر فطرت کی کئی بھید افشا کیے ہیں۔ مثلاً دیوان غالب کئی بار پڑھا ہے اور ہر دفعہ اس میں نئی لذت اور نیا کیف پایا ہے۔ بعض اوقات تو اشعار کی نئی نئی تشریحات کھلتی ہیں۔ میر اور غالب کا عاشق ہوں اقبال کا بھی اچھا خاصا مطالعہ کیا ہے۔ کلیات اقبال ایسی چیز نہیں کہ ایک مرتبہ پڑھ کر پھر طاق پر رکھ دی جائے۔ بلکہ یہ کتاب بار بار اور مسلسل مطالعے کے لائق ہے۔ فیض، ممتاز مفتی، مشتاق احمد یوسفی اور عطاء الحق قاسمی کو بہت پڑھا ہے۔ احمد فراز سے بہت دوستی اور تعلق خاطر رہا۔ اپنی پہلی کتاب "سر زنداں" کے کئی شعروں میں فراز کے توجہ دلانے پر ترمیم کی۔ فراز کے انتقال پر کچھ شعر بھی کہتے تھے۔

زمیں زادہ فلک کے سفر پہ جا نکلا
وہ ایک شعر فراز ہنر پہ جا نکلا

ارژنگ: اب تک کتنے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں؟

عطا محمد خان: اب تک تین شعری مجموعے "سر زنداں"، "بساط خواب" اور "تکون" شائع ہو چکے ہیں۔

ارژنگ: آپ دانش ور ہیں، بیوروکریٹ ہیں اور تخلیق کار بھی ہیں۔ آپ کے خیال میں پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ کون سا ہے اور اس کا حل کیا ہے؟

عطا محمد خان: پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ قومی جہتی ہے۔ کیا ہم ایک قوم بن سکے ہیں یا کوئی حادثہ یا واقعہ یا جنگ ہی ہمیں ایک ہجوم سے ایک قوم کی شکل دے سکتی ہے، ہاں جہاں تک ادبی مسائل کا ذکر ہے تو راستے کی رکاوٹیں ہیں۔ یہاں ذہین بہت ہیں ان کے اظہار کی راہ میں رکاوٹیں ہیں۔ تخلیق کار بہت ہیں ان کا ہنر اجاگر ہونے میں رکاوٹیں ہیں۔ دینے والے ہاتھ بہت ہیں لیکن لینے والے ہاتھوں کے راستے میں رکاوٹیں ہیں۔ پاکستان اس اعتبار سے بہت خوش قسمت ہے کہ یہاں رفاہ عامہ، فلاح یا عام لفظوں میں خیرات کرنے کا جذبہ رکھنے والے بہت ہیں لیکن ان کی خیرات صحیح طریقے سے مستحق افراد تک پہنچ نہیں پاتی۔

ارژنگ: چاند کو دیکھ کر کس کا خیال آتا ہے؟

عطا محمد خان: چاند کو دیکھ کر چاندنی میں نہائے ہوئے ماحول کا حسن یاد آتا ہے۔ دو ہی تو چیزیں ہیں جو فطرت کے حسن کو نکھارتی ہیں، ایک چاند کی چاندنی اور دوسری چیز ہے صبح کا منظر۔ جوش صاحب نے کہا تھا۔

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لئے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

ارژنگ: کیا آپ اپنی شاعری کو وہ وقت دے پائے ہیں جس کی وہ متقاضی تھی؟

عطا محمد خان: شاعری میری محبت ہے اور محبت لمحاتی احساس کا نام نہیں ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے جو عمر بھر لہو اور روح میں رچا بسا رہتا ہے۔

ارژنگ: آپ کا نظریہ فن کیا ہے؟

عطا محمد خان: ارسطو نے شاعری کو تزکیہ نفس کا بہترین ذریعہ قرار دیا ہے۔ ورڈز ورتھ نے شاعری کو تمام علوم کی خوشبو کہا ہے۔ آرنلڈ نے شاعری کو زندگی کا ترجمان قرار دیا ہے۔ بہت سے ائمہ، اولیا، صلحا، علما، فلسفیوں، منطقیوں اور عروضیوں نے شاعری کی ہے۔ وجہ یہی کہ شاعری ہر ذوق سلیم رکھنے والے کو متاثر کرتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں حساسیت فکر کا جوہر ہے۔ آپ جب گردوپیش کی دنیا اور خارجی ماحول سے متاثر ہوتے ہیں۔ یا پھر آپ کے اندر کی حساسیت حصار توڑ کر باہر نکلتی ہے تو وہ شعر کا روپ

دھار لیتی ہے۔ نظریہ فن میں بہت سے چیزیں آجاتی ہیں۔ مثلاً روایت سے بغاوت، نئی دنیا کی تلاش، خوابوں اور خیالوں سے محبت، ان دیکھے حسن کی جستجو، تخیل کی فراوانی، وفورِ جذبات، انفرادیت، آزادیٔ خیال، حسن سے تا بہ مقدار لطف اٹھانے میں آسودگی یا نا آسودگی کا احساس، رنگوں سے مہکتا ہوا ماحول، ہجرت، یہ سب کچھ آپ کے فن کو نکھارتے ہیں۔

اروِنگ: شاعری کے علاوہ اگر کسی اور صنف میں لکھتے تو وہ کونسی ہوتی؟

عطا محمد خان: شاعری کے علاوہ اگر کسی اور صنف میں لکھتا تو وہ بھی شاعری ہی ہوتی۔

اروِنگ: کیا پاکستانی ادب ہماری تہذیب، ثقافت اور معاشرت کا ترجمان ہے؟

عطا محمد خان: پاکستانی ادب یقیناً ہماری تہذیب، ثقافت اور معاشرت کا ترجمان ہے۔ ہماری شاعری، نثری ادب (خصوصاً ناول، افسانے اور ڈرامے) ہماری اپنی ہی دھرتی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ ہمارا شاعر اور ادیب اس دھرتی سے جڑا ہوا ہے کٹا ہوا نہیں۔

اروِنگ: سرکاری سرپرستی میں ہونے والے مشاعروں کی اہمیت اور مقاصد کیا ہیں؟

عطا محمد خان: سرکاری سرپرستی میں ہونے والے مشاعروں کی بہت اہمیت ہے۔ پہلے نواب، روٗسا اور امراء شعری محفلیں منعقد کرا کے شاعروں کی مالی اعانت یا سرپرستی کرتے تھے۔ چونکہ یہ ایک مہنگا سودا ہے اس لئے اس کے انعقاد اور فروغ کے لئے سرکاری سرپرستی ازحد ضروری ہے۔ مشاعرہ ایک تہذیبی روایت ہے اور اس روایت کو زندہ رہنا چاہئے۔ جب آپ بڑے اور اچھے شاعروں کو سنتے ہیں تو وہ لمحے آپ کی زندگی کے یادگار لمحوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ادبی ذوق رکھنے والے کسی بھی عام شخص کے لئے ممکن نہیں ہے کہ وہ فرداً فرداً شاعروں سے مل سکے لیکن محفلِ مشاعرہ ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جس سے ہر ادبی ذوق رکھنے والا عام شخص استفادہ کر سکتا ہے۔

اروِنگ: کیا آپ ادب میں تنقید کی اہمیت کے قائل ہیں؟

عطا محمد خان: تنقید نکھارتی ہے۔ اسی لئے ہر عہد میں ادبی تنقید کے نئے معیار اور زاویے تراشے جاتے ہیں۔

اروِنگ: اپنی زندگی کا کوئی یادگار واقعہ قارئین سے شیئر کیجیے۔

عطا محمد خان: واقعہ تو ایک لمبی کہانی ہے مگر مختصراً یہ کہ مجھے 1994 میں کچھ دہشت گرد اغوا کر کے افغانستان لے گئے اور تقریباً 5 ماہ ان کی سخت ترین قید میں رہا۔ اس دوران جو زندگی اور موت سے متعلق دریچے وا ہوئے وہ میں نے "سرِ زنداں" میں رقم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی دوران مجھے "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" کا مفہوم بھی سمجھ آیا۔

اروِنگ: قارئین کے لیے کوئی پیغام؟

عطا محمد خان: پیغام صرف اور صرف یہ ہے کہ برداشت اور تحمل کا مادہ پیدا کریں اور دوسروں کو آسانیاں تقسیم کریں۔

بقیہ انٹرویو ناصر معروف

ونگ کا ڈپٹی ہیڈ ہوں۔ اس کلب کے چیئرمین جناب میاں محمد منیر صاحب اور وائس چیئرمین احسن حیات راجہ صاحب ہیں جو خود بھی بڑا ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ ہم سوشل کلب کے زیرِ اہتمام چھوٹے بڑے کئی ادبی پروگرام کروا چکے ہیں۔ اور آئندہ بھی کئی بڑے ادبی مشاعرے کروانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اروِنگ: دیارِ غیر میں رہتے ہوئے بھی اجنبیت کا احساس تو ہوتا ہوگا۔

ناصر معروف: جی ایسی بات نہیں ہے سلطنت عمان اب دیارِ غیر نہیں رہا اب یہ ہمارا دوسرا گھر ہے سلطنت عمان عالمی برادری میں ایک پُر امن اور خوشحال ملک کے طور پر جانا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہمیں، دیارِ غیر میں رہتے ہوئے بھی اپنے گھر میں رہنے کا احساس ہوتا ہے۔ اس ملک میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو کسی بھی پُر امن اور ترقی یافتہ ملک میں ہوتی ہیں۔ ہم اس ملک کی مزید ترقی کے لیے دعا گو ہیں۔

عجب تقاضے ہیں چاہت کے کاروبار کے بھی
میں مطمئن نہ ہوا اُس پہ جان وار کے بھی
تڑپ تو جاتا ہے انسان مر نہیں جاتا
تمہارے ہجر میں دیکھے ہیں دن گزار کے بھی
علی رضا

مختصر ادبی خبریں/تقریبات

ہو نگاہ کرم کی تقریب پذیرائی

ممتاز شاعر عمران مفتی کے پہلے نعتیہ شعری مجموعے کی تقریب پذیرائی 30 اکتوبر کو ایمبیسڈر ہوٹل لاہور میں منعقد ہوئی۔ تقریب کی صدارت نامور ادیب اور چیئرمین پی ٹی وی عطاء الحق قاسمی نے کی۔ مہمانِ خصوصی منصور آفاق جبکہ مہمانانِ اعزاز ڈاکٹر صغرا صدف (ڈی جی پلاک)، کیپٹن (ر) عطا محمد خاں (چیف ایگزیکٹو لاہور آرٹس کونسل) اور ندیم بھابھہ تھے۔ نظامت کے فرائض عاصم خواجہ نے بخوبی ادا کیے۔ تقریب کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ اس کے بعد شاعر، سفرنامہ نگار اور تقریب کے میزبان چیئرمین ''پہچان انٹرنیشنل'' حسن عباسی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور اپنی حمد بھی پیش کی۔ نعت رسولِ اکرمؐ کی سعادت عاصم خواجہ نے حاصل کی۔ تقریب میں صاحب کتاب عمران مفتی کی شخصیت اور نعتیہ شاعری کے حوالے سے بھرپور گفتگو ہوئی۔ اظہار خیال کرنے والوں میں آئینہ مثال، محمد اسد خاں، مظہر نیازی، حسین مجروح تھے۔ عطاء الحق قاسمی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں عملی طور پر سیرت حضور اکرم کو اپنانا چاہیے۔ منصور آفاق نے عمران مفتی کے نعتیہ مجموعے کو سراہتے ہوئے بصیرت افروز گفتگو کی۔ ڈاکٹر صغرا صدف نے گفتگو کرتے ہوئے ''ہو نگاہ کرم'' کو نعتیہ شاعری میں ایک اہم اور منفرد شعری مجموعہ قرار دیا۔ ندیم بھابھہ نے نعت کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے عمران مفتی کی نعت کا حوالہ دیا اور ان کو مبارک پیش کی۔ پہچان انٹرنیشنل کے زیر اہتمام منعقدہ اس تقریب کے آخر میں عمران مفتی نے اپنی ذات اور نعت کے بارے میں گفتگو کی اور منتخب نعتیں بھی سنائیں جنہیں حاضرین نے بہت ذوق اور شوق سے سنا۔ آخر میں مہمانوں کے لیے پرتکلف ڈنر کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔

بزم انمول کی محفل مسالمہ

ادبی تنظیم ''بزم انمول'' کے زیر اہتمام محرم الحرام کے تقدس کے حوالے سے محفل مسالمہ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت نامور شاعر اور چیف ایگزیکٹو لاہور آرٹس کونسل کیپٹن (ر) عطا محمد خان نے کی۔ مہمانانِ خصوصی حسن عباسی اور علی رضا تھے۔ جبکہ مہمانانِ اعزاز عمران مفتی اور اسد باقی تھے۔ نظامت کے فرائض عاصم خواجہ نے ادا کیے۔ اس بابرکت محفل میں لاہور اور دیگر شہروں سے تشریف لائے ہوئے شعرا نے شرکت کی اور اپنا نذرانہ عقیدت بحضور سید الشہدا اور اہل کربلا کے نام منسوب کیا۔ محفل مسالمہ میں حاضرین نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ بزم انمول کی صدر انمول گوہر نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ وہ مستقبل میں ایسی تقاریب کا انعقاد کراتی رہیں گی۔

گلشن ادب کا ماہانہ مشاعرہ

ادبی تنظیم گلشن ادب کی ماہانہ محفل مشاعرہ ماہ اکتوبر معروف پنجابی شاعر عاشق رحیل کی رہائش گاہ پر منعقد ہوئی جس کی صدارت محمد ممتاز راشد لاہوری نے کی۔ مہمانِ خصوصی معروف شاعرہ انمول گوہر تھیں۔ نظامت کے فرائض عاصم خواجہ نے ادا کیے۔ اس مشاعرہ میں عباس مرزا، بابو رمضان شاہد، ظہیر احمد ظہیر، عدل منہاس لاہوری، عقیل شافی، ہمایوں پرویز، شاہد عمران، حسن عباسی، امین ایکی، ساجد پریمی، علامہ فضل حق گلشن اور سلطان کھاروی نے شرکت کی۔ ہر اچھے شعر پر حاضرین نے دل کھول کر داد دی۔

لاہور میں محفل مسالمہ کا انعقاد

اردو ادب میں اکبر الہ آبادی کے بعد مزاحیہ شاعری کے حوالے سے بے پناہ شہرت پانے والے شاعر سید محمد جعفری مرحوم کی آبائی رہائش گاہ نواب پیلس امپیریل روڈ لاہور میں گزشتہ دنوں ایک محفل مسالمہ کا انعقاد کیا گیا۔ جس کی صدارت معروف شاعر ممتاز راشد لاہوری نے کی۔ مہمان خصوصی خوبصورت لہجے کے شاعر، صحافی، زاہد عباس سید جب کہ مہمان اعزاز نامور شاعر حسن عباسی تھے۔ نظامت کی ذمہ داریاں صدارتی ایوارڈ یافتہ شاعر اور پی ٹی وی کے پروڈیوسر علی رضا نے ادا کیں۔ اس موقع پر جن شاعروں نے بارگاہ امام عالی مقام

میں نذرانہ عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ان میں ممتاز راشد لاہوری، زاہد عباس سید، حسن عباسی، پروفیسر ریاض احمد، شیخ اعجاز رضوی، پروفیسر آغا علی مزمل، انیس احمد، اعجاز فیروز اعجاز، آفتاب خان، علی رضا، ارسلان احمد ارسل، فراست بخاری، اقبال پیام اور زاہد محمود حسن کے نام شامل ہیں۔

علی رضا کی والدہ مرحومہ کی دوسری برسی کے موقع پر نعتیہ محفل

صدارتی ایوارڈ یافتہ شاعر پی ٹی وی کے پروڈیوسر علی رضا اور ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن ساہیوال کے نائب صدر آغا محمد رضا خان ایڈووکیٹ کی والدہ مرحومہ کی دوسری برسی کے موقع پر ان کی رہائش گاہ چوک حسینی ساہیوال میں ایک محفل نعت منعقد ہوئی۔ جس میں نظامت کی ذمہ داریاں بھی علی رضا نے ادا کیں۔ منعقدہ محفل میں معروف شاعروں ایزد عزیز، رانا سردار پرویز، حسرت بلال، علی رضا کے علاوہ نامور نعت خوانوں قاری غلام حسن بصری، ملک محمد سلیم، علی رضا، سید احمد نقشبندی، عبدالرزاق فریدی، ابرار شاہد قادری اور غلام عباس ساغری نے بارگاہ رسالت مآبؐ میں ہدیہ عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔ اس محفل میں روحانی شخصیت مرزا عامر فاروق پنجتنی اور ملک اقبال حیدر ایڈووکیٹ نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم جناب رسالت مآبؐ کی تعلیمات پر نہ صرف عمل پیرا ہوں بلکہ ان کے اسوہ حسنہ کی روشنی میں زندگیوں کو گزارنے کی سعی کریں اور ملک میں امن وامان اور محبتوں کے فروغ میں اپنا مثبت کردار ادا کریں۔ محفل میں سید امام کوثر زیدی، آغا حسن رضا خان، فیصل الرسول، شفقت چوہدری، اظہر حسین اور دیگر نے بھی شرکت کی۔

ناصر باغ لاہور میں محفل مسالمہ

بزم عامل کے زیر اہتمام ناصر باغ لاہور میں محفل مسالمہ منعقد ہوئی۔ صدارت سید گلزار بخاری نے کی۔ مہمانان خصوصی میں سید فراست بخاری، اقبال راہی اور ڈاکٹر جواز جعفری تھے۔ نظامت کے فرائض عقیل شافی نے ادا کیے۔ مظفر ابن عامل، تسیم بخاری، سید شبیہ الحسنین، ظہیر احمد ظہیر، ہمایوں پرویز شاہد، میجر خالد نصر، اویس گلزار، عطا العزیز، منور ابن عامل، عدل منہاس لاہوری، شفیق عطاری و دیگر شامل تھے۔

نوجوان شاعر قاسم خیال کے اعزاز میں سرگودھا رائٹرز کلب کا خصوصی اجلاس

سرگودھا رائٹرز کلب کا ماہانہ ادبی اجلاس پروفیسر صاحبزادہ عبدالرسول کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ جبکہ حمزہ گوندی، مہمان خصوصی اور قاسم خیال شاعر اعزاز تھے۔ اجلاس دو نشستوں پر مشتمل تھا۔ پہلی نشست میں، پروفیسر سید مرتضیٰ حسن کی تحقیقی وتنقیدی کتاب، سرگودھا میں آپ بیتی کی روایت، پر ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، ذوالفقار احسن، عابد خورشید اور حمزہ گوندی نے اپنے اپنے مضامین پیش کیے۔

ادب سرائے ساہیوال کے زیر اہتمام تعزیتی ریفرنس

گزشتہ دنوں فعال علمی و ادبی تنظیم ادب سرائے ساہیوال کے زیر اہتمام بین الاقوامی شہرت یافتہ نعت خواں، شاعر سید منظور الکونین اور ممتاز بزرگ شاعر، شعری مجموعہ کلام ''ستارے ٹانکتے رہنا'' کے خالق پروفیسر میاں محمد مرغوب کی یاد میں دفتر ادب سرائے فرید ٹاؤن میں تعزیتی ریفرنس منعقد ہوا۔ جس کی صدارت معروف بزرگ شاعر اور قومی سیرت ایوارڈ یافتہ نعت گو پروفیسر سید ریاض حسین زیدی نے کی۔ جبکہ میاں عارف عبدالستار (فرزند پروفیسر میاں محمد مرغوب) مہمان خصوصی تھے۔ منعقدہ تعزیتی ریفرنس میں نظامت کے فرائض قومی وصوبائی سیرت ایوارڈ یافتہ شاعر اور پی ٹی وی لاہور کے پروڈیوسر علی رضا نے انجام دیے۔ اس موقع پر جن ادیبوں اور شاعروں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ان میں پروفیسر سید ریاض حسین زیدی، میاں عارف عبدالستار، پروفیسر محمد اکرم ناصر، پروفیسر ارجمند احمد قریشی، ایزد عزیز، راؤ شفیق احمد، نعیم نقوی، رانا سردار پرویز، واصف سجاد، اسلم سحاب ہاشمی، شمشیر حسین زاہد، حسرت بلال، علی رضا، مظہر شیراز، غلام محمد عاصی، خضر حیات محسن، ڈاکٹر مرتضیٰ ساجد اور فدا بخاری کے اسم گرامی شامل ہیں۔ مقررین نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ سید منظور الکونین اور پروفیسر میاں محمد مرغوب نے نعت خوانی اور شعری ونثری میدان میں جو خدمات

انجام دی ہیں انھیں دیر تک یاد رکھا جائے گا۔ اس تعزیتی اجلاس میں اہل علم و ادب کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

بزم پرنم کی محفل مشاعرہ

استاد پرنم الٰہ آبادی کی یاد میں بزم پرنم نے الحمرا ادبی بیٹھک میں محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا جس کی صدارت نامور ٹی وی آرٹسٹ راشد محمود نے کی۔ مہمانانِ خصوصی نامور شاعرہ نیلما ناہید درانی اور سعدیہ صفدر سعدی (شیخوپورہ) تھیں۔ جبکہ مہمانانِ اعزاز عمران منتی اور اسد باقی تھے۔ مشاعرے میں لاہور کے علاوہ دیگر شہروں سے تشریف لائے ہوئے شعرا نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ یہ محفل مشاعرہ کی نظامت اقبال راہی نے کی۔ مشاعرہ کے اختتام پر بزم پرنم کے چیئرمین محمد اقبال پیام شجاع آبادی نے استاد پرنم کے حوالے سے گفتگو کی اور اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ مستقبل میں بھی ایسی تقاریب کا انعقاد کرتے رہیں گے۔ تقریب کے اختتام پر ضیافت کا بھرپور اہتمام کیا گیا تھا۔

بزم پرنم کی یاد میں محفل مشاعرہ

گزشتہ دنوں بزم پرنم کے زیر اہتمام ادبی بیٹھک الحمرا میں پرنم الٰہ آبادی کی یاد میں ایک یادگار مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ اس مشاعرے کو پرنم صاحب کے شاگرد خاص اقبال پیام نے ترتیب دیا تھا۔ الحمرا ادبی بیٹھک میں منعقدہ مشاعرے کی صدارت معروف آرٹسٹ، شاعر، راشد محمود نے کی۔ مہمانانِ خصوصی میں ڈاکٹر اخلاق احمد گیلانی، سعدیہ صفدر سعدی، نیلما ناہید درانی اور نذیر قیصر شامل تھے۔ حسن عباسی نے پرنم الٰہ آبادی کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ وہ ایک ہمہ جہت اور ہمہ گیر شاعر تھے۔ ان کا نعتیہ کلام آج بھی پورے زمانے میں گونج رہا ہے۔ انھوں نے اقبال پیام کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اپنے اُستادِ محترم کا کلام ضائع نہیں ہونے دیا اور یہ کتابی شکل میں محفوظ کر لیا۔ پرنم صاحب کی غزلیں بھی کافی مشہور ہوئیں اور کئی گلوکاروں نے انھیں اچھے انداز میں گایا۔ حسن عباسی کے خطاب کے بعد ناظم مشاعرہ اقبال راہی نے اپنے کلام سے مشاعرے کا آغاز کیا۔ اس مشاعرے میں میاں والی، شیخوپورہ، ڈیرہ غازی خان ملتان اور دیگر شہروں سے بھی شعرا حضرات آئے ہوئے تھے۔ یہ مشاعرہ تین گھنٹے جاری رہا۔ آخر میں اقبال پیام نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور استاد محترم کے لیے دعا کرائی۔ مشاعرے میں حصہ لینے والے چند شعرا کے نام ارشاد محمود، نیلما ناہید درانی، ڈاکٹر اخلاق گیلانی، عمران منتی، شاہد علی قریشی، سعدیہ صفدر سعدی، نذیر قیصر، حسن عباسی، رائے عابد علی، آفتاب خاں، شہزاد ملک، اقبال پیام، اسد علی باقی، رانا عبدالجبار، قیصر عثمان شمسی، اسما منتور، اسلم شوق، طارق چغتائی، وحید ناز، اقبال راہی، راقم الحروف

یوں اپنی آنکھ سے دیکھا ہے بام و در کا بٹوارہ
میرے ہاتھوں سے ہو جاتا ہے میرے گھر کا بٹوارہ

ادھورے خواب آنکھوں سے مجھے باہر گرانے ہیں
مجھے کچھ اس طرح کرنا ہے چشمِ تر کا بٹوارہ

محبت بانٹ دینے کی کوئی باتیں نہیں کرتا
ہمیشہ لوگ کرتے ہیں یہ سیم و زر کا بٹوارہ

منافق اور مخلص کی ابھی پہچان ہونی ہے
ابھی تو ایک دن ہونا ہے دنیا بھر کا بٹوارہ

مرے اندر لڑائی ظاہر و باطن کی رہتی ہے
مجھے کرنا ہے اب گوہر میرے اندر کا بٹوارہ

انمول گوہر/لاہور

زمیں سے ہے نہ ہمیں آسماں سے خطرہ ہے
تری نگاہوں کے جادو بیاں سے خطرہ ہے

ہزار چاند مرے راستے میں ہیں موجود
ستارہ آنکھوں کی اب کہکشاں سے خطرہ ہے

غریبِ شہر کے تو مسئلے نہ حل ہوں گے
امیرِ شہر کو اس داستاں سے خطرہ ہے

مرے وطن میں بھی نادان ہیں بہت ایسے
جو کہتے ہیں ہمیں اردو زباں سے خطرہ ہے

گلوں کی پتیاں مرجھاتی جاتی ہیں باہم
چمن کو اپنے یہاں باغباں سے خطرہ ہے

خالد مسعود/لاہور

تبصرۂ کتب/فلیپ/آراء

نام کتاب: سبیل/شاعر: شہاب صفدر/صفحات: 160 / قیمت: 300روپے/تبصرہ نگار: ڈاکٹر ریاض مجید
ناشر: نستعلیق پبلی کیشنز، لاہور 0300-4489310

فن کا اظہار فنکار سے ریاضت مانگتا ہے، احساس سے اظہار تک کے سارے مرحلوں میں ریاضت...... لفظوں کی ترتیب مجموعہ فن کی اقلیم میں تب داخل ہوتی ہے جب فنکار ہر پہلو سے فن پارے پر محنت کرے۔ نعت رسول کا معاملہ اس ریاضت کے ساتھ اخلاص کی ہمہ گیریت بھی طلب کرتا ہے۔ یہ تمہید شہاب صفدر کے مجموعہ نعت میں جھلکنے والی ریاضت کے حوالے سے ہے۔ اس کا لب ولہجہ اور اسلوب معاصر نعت نگاروں کے حوالے سے نادرہ کاری کی اہل کرافٹ کا مظہر ہے۔ نعتیہ زمینوں کے حوالے سے اس کی محنت کا اظہار نعتیہ مطلعوں سے قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لیتا ہے۔

شہاب صفدر نے مشکل اور سنگلاخ زمینوں میں جس انداز کی نعت گوئی کی ہے اس کی مثال معاصر نعت میں خال خال ملے گی۔ ان کی طبیعت کا جولان اور ان کی شعر گوئی کا ریاضت کیش اسلوب نادرہ کاری کی خواہش میں نئی نئی زمینوں کا متلاشی ہے۔ انہوں نے محسن کاکوروی کے معروف نعتیہ قصیدہ کی طرز پر جو خوبصورت اور پرشکوہ نعتیہ قصیدہ کہا ہے وہ لائق توجہ ہے۔ شہاب صفدر کامیاب غزل گوئی سے نعت ومنقبت کی طرف آئے ہیں۔ ان کے پاس ذخیرہ الفاظ بھی ہے اور شوق فراواں بھی۔ امید ہے اردو نعت کے معاصر منظر نامے میں ان کی محنت اور ریاضت کے ثمرات قارئین سے ضرور داد وصول کریں گے۔

نام کتاب: زندگی کے چاک پر/شاعر: سحر تاب رومانی/صفحات: 160 / قیمت: 300روپے/تبصرہ نگار: رانا سعید دوشی
ناشر: رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی 0345-2610434

سحر تاب رومانی آج کی اردو غزل سے مکمل طور پر آشنا اور وابستہ ایسا معتبر نام ہے جس نے اپنی بساط کے مطابق کھری اور خالص نعت سے غزل کے خدوخال کو سنوارنے کی سعی میں اپنے آپ کو ہمہ وقت مشغول رکھا ہے۔ اردو غزل نے بھی اس کی شعری لگن اور عقیدت کو بے ثمر نہیں جانے دیا اس طرح انہوں نے اپنی شناخت کو نہ صرف مستحکم کیا بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی عزت اور توقیر پانے میں پوری طرح کامیاب رہے:

ایسے عالم میں زندہ ہوں جس میں بس　　　مجھ کو میری کوشش زندہ رکھتی ہے

میں سمجھتا ہوں کہ اپنی کوششوں پر ایمان رکھنے والے اس تیموری صفات کے مالک شاعر کو اپنے راستے خود بنانے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی ان کی غزل میں ان کے جذبے بھرپور تغزل کے ساتھ اس طرح شعر بنتے نظر آتے ہیں کہ فضا جھومتی محسوس ہوتی ہے ان کی غزل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں وہ اپنے محبت فاتح عالم کے نظریہ کے ساتھ ہر جگہ خود موجود ہوتے ہیں۔ ان کی غزل میں معاشی، اقتصادی، معاشرتی، سماجی اور اخلاقی موضوعات بھی نہایت سلیقے سے اپنی جگہ بناتے ہیں مگر ان موضوعات میں بھی رومانی جذبوں کی زیریں لہریں ساتھ ساتھ چلتی محسوس ہوتی ہیں۔ کہیں یہ زیریں لہریں، نہایت خفیف ہیں اور بعض مقامات پر بہت نمایاں۔

سحر تاب رومانی کی غزل میں ایک خاص قسم کی وضع داری اور رکھ رکھاؤ واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے، جو ان کو یقیناً ان کی طبع سلیم کی دین ہے اور محبت کے تقاضوں سے پوری طرح آشنائی ان کی غزل کا خاص وصف ہے۔

نام کتاب: یہ جو لاہور سے محبت ہے/شاعر: ڈاکٹر فخر عباس/صفحات: 160 / قیمت: 400روپے/تبصرہ نگار: نذیر قیصر
ناشر: بک کارنر، جہلم

ڈاکٹر فخر عباس نے جو کہا ہے کہ　یہ جو لاہور سے محبت ہے　　یہ کسی اور سے محبت ہے

ڈاکٹر فخر عباس محبت کرنے اور محبت نبھانے کی صلاحیتوں سے مالا مال ہیں۔ ان سے جو بھی ایک بار مل لیتا ہے بس انہی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ شاعروں

ادیبوں کے قبیلے کے علاوہ بہت سے لوگ جو کسی مرض میں مبتلا ہو کر ان کے پاس بغرض علاج تشریف لاتے ہیں وہ صحت یاب ہونے کے بعد مرض محبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

یہ جو لاہور سے محبت ہے کے ساتھ کسی اور کا تذکرہ شامل ہے۔اس تناظر میں ڈاکٹر فخر عباس کی شخصیت افق تا افق وسعت اختیار کرتی ہوئی لاہور بنتی ہے اور پھر کینوس پر کسی اور کی تصویر ابھرتی ہے جو ان گنت روشنیوں اور رنگوں کے ساتھ ساری کائنات پر چھانے لگتی ہے۔

ڈاکٹر فخر عباس کی شاعری میں محبت کے روایتی سوز کی بجائے ایک نشاط آمیز آہنگ کا دھیما دھیما سرور اور سرشاری عجیب کیفیت پیدا کرتی ہے۔جو زندگی کی علامت ہے۔یہ کیفیت اس لیے بھی خاص ہے کہ ہماری شاعری زندگی کی نشاط آمیزی سے خالی ہوتی جارہی ہے۔زندگی سے بھرپور اس محبت کے لیے ہم ڈاکٹر فخر عباس کے ممنون ہیں۔

نام کتاب: خواذ زاد/شاعر: نعیم گیلانی/صفحات: 160/قیمت: 300روپے/تبصرہ نگار: سلیم کوثر
ناشر: انحراف پبلی کیشنز، لاہور 0333-6509204

کہیں کچھ ٹھیک نہیں ہے، لیکن کہیں کہیں کچھ ٹھیک بھی ہے ادب کا ہی نہیں دوسرے شعبے بھی ایسی آوازوں کی زد پر ہیں۔یہ جو ٹھیک نہیں ہے اور یہ جو کہیں کہیں کچھ ٹھیک بھی ہے کا درمیانی عرصہ ہے یہی غزل کی شیرازہ بندی کا عہد ساز دورانیہ ہے۔نعیم گیلانی نئی دنیا کی حیرتوں سے جنم لینے والے تجربوں مشاہدوں اور سوچ بچار کی دھنک آمیز کیفیات کا شاعر ہے، وہ مملکت سخن کی لامحدود وسعتوں میں سے سب سے بڑے صوبے غزل آباد کا قدیم شہری ہے۔وہ نظمیں بھی لکھتا ہے مگر وہ اس کی ادھوری رہ جانے والی غزلوں کا حصہ ہیں۔نعیم گیلانی ابتدا ہی سے صف اول کے شعرا میں موجود ہے اور نظر بھی آتا ہے۔نعیم گیلانی کا سفر ایک پر اعتماد شاعر کا ارادہ ہی نہیں حوصلہ بھی ہے۔خدا کرے وہ اس محنت سے جی نہ چرائے جس کا تقاضہ یہ فن ہر شاعر سے کرتا ہے۔میری دعا ہے اس کے گلشن شاعری میں بہار آفریں موسموں کے رت جگے لہلہاتے رہیں، وہ ان ہریالی رتوں کے افق پر اپنی نیندوں کا حاشیہ کھینچتا رہے اور ان حاشیوں کی روشنی میں اس کا فکری اور تجرباتی افق غزل آشنائی کے نئے ستاروں سے جگمگاتا رہے۔

نام کتاب: حوالہ/شاعر: نیازت علی نیاز/صفحات: 160/قیمت: 300روپے/تبصرہ نگار: حسن عباسی
ناشر: نستعلیق پبلی کیشنز، لاہور 0300-4489310

نیازت علی نیاز سے جب میری پہلی ملاقات ہوئی تو مجھے یوں لگا جیسے میں ایک ایسے شخص سے مل رہا ہوں جو صدیوں کا سفر کر کے دھول اور گرد میں اٹا ہوا مجھ تک پہنچا ہے۔

نیازت بھی اپنے آپ میں اس طرح گم تھا جیسے خوشبو پھول میں گم ہوتی ہے۔نیازت مجھے پہاڑوں سے آنے والے اس پرشور دریا کی طرح لگا جس کا پانی پنجاب کے میدانوں میں آکر خاموشی سے بہنے لگتا ہے۔میں اس کی خاموشی سے خوفزدہ رہا اور اجنبیت کے کنارے پر بیٹھا رہا۔گہری خاموشی مجھے اس ڈوبتی ہوئی لڑکی کی طرح لگتی ہے جو اپنی طرف ہاتھ بڑھانے والے کو بھی ساتھ ڈبو دیتی ہے۔آج جب میں نیازت کی شاعری پڑھ رہا ہوں تو اس کی خوشی بھی مجھ پر کھلتی جارہی ہے۔بقول سید مبارک شاہ: خوشی کا سبب کیا پوچھتے ہو سخن آغاز کرنا آ گیا تھا

نیازت کو بھی سخن آغاز کرنا آ گیا ہے۔میں نے ایک بار ہندوستانی لڑکی پلاودی سے جب پوچھا کہ تم کس سے محبت کرتی ہو تو اس نے کہا اپنے کزن سے۔ میں نے پوچھا کہ وہ بھی تم سے محبت کرتا ہے؟ تو اس کا جواب بے ساختہ تھا کہ اس کی آنکھوں سے تو لگتا ہے۔میرا جواب بھی بے ساختہ ہے کہ نیازت کی شاعری سے تو لگتا ہے کہ اسے سخن آغاز کرنا آ گیا ہے۔اس لئے وہ خاموش رہنے لگا ہے۔سخن آغاز کرنا آ جائے تو بہت سے اندیشے گھیر لیتے ہیں۔

شاعری کرنا اور پرندے پالنا ایک جیسا شوق ہے۔ان کے مرجانے کا دھڑکا ہر وقت لگا رہتا ہے۔جیسے ہی موسم بدلتا ہے یہ خوف اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ شاعری میں بھی بدلتے موسموں کے ساتھ اپنے ہی شعروں اور نظموں کے مرجانے کا خوف لاحق ہو جاتا ہے۔اب نیازت جب اپنا پہلا شعری مجموعہ منظر عام پر

لار ہا ہے تو خوشی کے ساتھ ساتھ اسے بہت سے اندیشوں نے بھی گھیر رکھا ہے۔ ہر جنوئی تخلیق کار کا یہ المیہ ہے کہ وہ اپنی تخلیق سے کبھی مطمئن نہیں ہو پاتا۔ مجھے نیازت میں جو بات دیگر شعراء سے منفرد لگی ہے وہ یہ ہے کہ دوستوں کی واہ واہ پر وہ خوش ہونے کے بجائے پریشان ہو جاتا ہے اور اپنی شاعری کو الہامی سمجھنے کی بجائے اس کو مزید بہتر کرنے کی سعی کرتا ہے۔ غزل تو نیازت پہ کالر کے پھول کی طرح سجتی ہے جبکہ نظم اس کے دل کے اندر اگی ہے اور اس طرح کھلی ہے کہ نہ صرف اس کے جسم کو مہکا گئی ہے بلکہ اس کے ارد گرد بیٹھے لوگوں کی سانسیں بھی معطر ہو گئی ہیں اور اب کتاب شائع ہونے کی دیر ہے اس چنبیلی کی خوشبو قریہ بہ قریہ کو بہ کو قاری کو بھی مہکا دے گی۔ اپنی ذات جیسی شاعری تو بہت سے شاعر کرتے ہیں مگر میں یہ کہوں گا کہ میں اس میں تمیز نہیں کر سکتا کہ کہاں نیازت علی نیاز ختم ہوتا ہے اور اس کی نظم شروع ہو جاتی ہے اور کہاں نظم ختم ہوتی ہے اور نیازت سامنے آجاتا ہے۔ جو لوگ نیازت سے ملے ہیں وہ میری اس بات کی گواہی دیں گے۔ نیازت کی نظم کی ایک خوبی جو اسے منفرد مقام عطا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کا اسلوب روز مرہ گفتگو کے بہت قریب ہے۔ جب وہ نظم سنا رہا ہوتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی واقعہ سنا رہا ہے یا اپنے آپ سے باتیں کئے جا رہا ہے۔ اسے اپنی شاعری سے بہت زیادہ خوش گمانی نہیں ہے اس لئے مجموعہ شائع ہونے کے بعد بھی اس کا کوئی نقصان نہیں ہونے والا اور مجھے امید ہے کہ وہ اپنا شعری سفر پہلے سے بھی زیادہ انفرادیت اور لگن سے جاری رکھے گا ورنہ پہلا شعری مجموعہ بہت سے شاعروں کا آخری مجموعہ ثابت ہوتا ہے۔ نیازت علی نیاز کی شخصیت اور شاعری مجھے دونوں پسند ہیں کیونکہ وہ ایک ایسے شجر کی طرح ہے جس کا سایہ نہ صرف گھنا ہے بلکہ وہ اپنی سمت کلہاڑا لے کر بڑھنے والے کو بھی اپنے سائے سے محروم کرنے والا نہیں ہے۔ نیازت کی سادگی، شرافت اور کم گوئی داد طلب ہے۔ اللہ اس کو ہمیشہ شاد و آباد رکھے اور اس کی شاعری کو معتبر بنائے۔ (آمین ثم آمین)

نام کتاب: مرقع انسانیت/ شاعر: مشتاق کھنڈیانوی/ صفحات: 88 / قیمت: 250 روپے/ تبصرہ نگار: نازاوکاڑوی

ناشر: مکتبہ فجر

نئی نسل جس طرح آج بے راہ روی کی جانب گامزن ہے۔ اس کی اصلاح ہم سب کی بھی اخلاقی ذمہ داری ہے۔ زلف، لب و رخسار کی شاعری جا بجا ملتی ہے۔ وہاں آج بھی شاعر حضرات اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے کما حقہ نئی نسل کو اپنے پیغام کے ذریعے اپنی ذمہ داریوں اور اپنی اشرافیہ کی اقدار کو قائم رکھنے میں اپنا کردار بخوبی ادا کر رہے ہیں۔ ان میں ایک جناب مشتاق احمد کھنڈیانوی صاحب پاک فوج سے بطور کمشنڈ آفیسر ریٹائر زندگی گذارنے کے ساتھ ساتھ نئی نسل کو بیدار کرنے میں نوجوانوں کی طرح مستعد نظر آتے دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں تک میں نے مطالعہ کیا ہے مجھے تو ان کی اس کاوش نے بہت متاثر کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں ایسی شاعری آج وقت کی اہم ضرورت ہے۔ خصوصاً نوجوان نسل کو اس کتاب کی بہت ضرورت ہے۔ مشتاق احمد کھنڈیانوی اس کے لئے مبارک باد کے مستحق ہیں مجھے امید ہے مستقبل میں بھی ملک و ملت کی بہتری کے لئے اپنی شاعری کے ذریعے مزید لکھیں گے۔

(نوٹ: مشتاق صاحب کی سوچ کو مد نظر رکھیں، عروض و بحور کو صرف نظر رکھیں)

نام کتاب: عربی جن دے تارے/ شاعر: عقیل شافی/ صفحات: 128 / قیمت: 250 روپے/ تبصرہ نگار: نازاوکاڑوی

ناشر: مکتبہ فجر

ادبی میدان میں عقیل شافی دا اک اگھرواں ناں اے۔ شاعری دے نال نال پروگراماں دی کمپیئرنگ وی اپنے اچیچے رنگ نال کرن وچ مشہور اے۔ عقیل شافی ہوریں اس توں پہلاں سی حرفی تے کجھ روز مرہ مسئلیاں تے قصیاں دے نال نال غزل پراگا جگ توں وچ بھیر ے، اپنے پڑھن والیاں تائیں اپڑا چکے نیں۔ عربی جن دے تارے انہاں دا اٹھواں مجموعہ اے۔ ایہدے وچ عقیل شافی ہوراں اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؐ دے گھرانے دے ساریاں جی آں دی جانکاری دتی اے۔ نا صرف جانکاری سگوں نبیؐ دے گھرانے نال اپنی عقیدت و محبت دا اظہار وی ہے۔ میں اس کاوش تے عقیل شافی نوں ڈھیر مبارک دیناں آں تے دعا اے پئی رب سوہنا عقیل شافی دی اس محبت نوں قبول کرے تے آگانہہ وی ایہو جیہے کم کرن دی توفیق دیوے۔ آمین

نامہ ہائے احباب

بہت عزیز و محترم حسن عباسی صاحب سلامت رہیں۔

میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں اور دعا گو ہوں کہ آپ ایک عرصہ سے ارژنگ میرے نام بھجوا رہے ہیں۔

تازہ ارژنگ میں محترم احمد جلیل صاحب نے جناب احمد ندیم قاسمی کے حوالے سے بہت خوبصورت مضمون لکھا ہے۔ قاسمی صاحب کے حوالے سے کوئی بھی لکھتا ہے تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس کی جس قدر ممکن ہو تحسین کروں۔ بلکہ ممکن ہو تو بالمشافہ اس کے ہاتھ چوموں۔ قاسمی صاحب بہت بڑے ادیب تو تھے ہی بہت عظیم انسان بھی تھے۔ یہ بتانا کچھ مناسب تو نہیں لگتا مگر میں ان کے ایصال ثواب کے لئے اکثر نوافل پڑھتا ہوں۔

یہاں ریکارڈ کی درستی کے ضمن میں یہ عرض کرتا ہوں یہ احمد جلیل صاحب نے مذکورہ مضمون میں قاسمی صاحب کے دو اشعار کے ساتھ دو شعر قتیل شفائی کے بھی نقل کر دیئے ہیں یقیناً ان کو مغالطہ ہوا ہے۔ قتیل صاحب کی یہ غزل میں نے ان کی زبانی ایک مشاعرہ میں بھی سنی ہے۔ اس غزل کا یہ مطلع ہے اور شعر ہے:

حالات کے قدموں پہ قلندر نہیں گرتا
ٹوٹے بھی جو تارا تو زمیں پر نہیں گرتا
گرتے ہیں سمندر میں بڑے شوق سے دریا
لیکن کسی دریا میں سمندر نہیں گرتا

(سلطان سکون)

بوئی ہزارہ

۲۔ ستمبر ۲۰۱۶

دل افروز احسن فرما پیارے ارژنگ

ہمیشہ شگفتہ اور رنگین رہو۔ نقش و رنگ جمیل سے میری ہوئی۔ ماشاء اللہ خوب ہو۔ سید منظور الکونین میرے پسندیدہ نعت خواں ہے۔ ان کی نعت سن کر ایک کیفیت سی طاری ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ وہ عہد کے خوش اور معتبر نعت خواں رہے ان سے متعلق مضمون کی اشاعت سب کو اچھی لگی ہوگی...... مضمون ''تنقید کیا ہے'' درس انگیز ہے آل احمد سرور نے تنقید کے باب میں بڑی معلوماتی باتیں بتائی ہیں وہ اردو ادب کے لائق اعتبار و اعتماد ناقد تھے۔ ان کی کتابیں ہر طالب علم کے لئے مرکز نگاہ ہیں۔ احمد جلیل نے ایک عہد کی موت لکھ کے احمد ندیم قاسمی کے مداحوں اور عقیدت مندوں کا مان بڑھایا ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے ادبی معیارات کی ترویج میں جتنی محنت اور محبت سے کام لیا ہے وہ بے مثال ہے۔ یہ سال احمد ندیم قاسمی کی یادوں کے لیے وقف ہے۔ احمد ندیم مرحوم کو کون بھلا سکتا ہے۔ قلمی اور علمی شخصیت آصف جاہ کی قلمی کردار تو سب پر روشن تھا ان کی ادبیت ابھی تک واضح نہیں کرتی فراست بخاری نے وضاحت کی ان کی بڑی مہربانی ہے۔ آصف جاہ کی یہ شعر دیکھئے۔

میں بھی اک ایسے مصور کا ہوں شہکار آصف
جو بدل دیتا ہے تصویروں کو تصویروں سے

عامر بن علی اور حسن عباسی قلم کے رہنما ہیں وہ کہتے ہیں اور لکھتے ہیں تو لفظوں کی تجلیاں آسمانوں سے اتر آتی ہے۔ گوہر ملسیانی کی موجودگی سے قدر و قیمت میں اضافہ ہوا۔ یہ غزل بار خاطر ہوئی۔ یاد کرتے ہو۔

خیر اندیش / آصف ثاقب

جوہر آباد / ستمبر ۲۰۱۶ء

محترم جناب حسن عباسی صاحب!

سلام مسنون۔ ماہنامہ ارژنگ باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ اس عنایت کے لئے شکر گزاری کے الفاظ ناکافی ہیں۔ کربلائے عشق کے عنوان سے ایک نظم اور ایک نعت ارسال کر رہا ہوں۔

ارژنگ ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہے۔ اردو ادب کے فروغ میں جناب عامر بن علی اور آپ کی کوششیں ناقابل فراموش ہیں۔

جناب علی رضا خان صاحب کی خدمت میں میرا سلام نیاز پہنچا دیجئے۔

خیر اندیش / مظفر حسن منصور

جوہر آباد (ضلع خوشاب)

برادرم حسن عباسی صاحب

سلام و آداب! آپ کی کرم فرمائی سے ماہنامہ ''ارژنگ'' باقاعدگی سے موصول ہو رہا ہے۔ اس کا ہر شمارہ اپنی زریں روایات کا امین ہوتا ہے اور بہت سے اہل قلم سے متعارف کراتا رہتا ہے۔ آپ اس میں راقم الحروف کی تحریروں کو بھی جگہ دیتے رہتے ہیں جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ میری نیک تمنائیں عامر بن علی صاحب کے لیے، آپ کے لیے اور ''ارژنگ کے سبھی بہی خواہوں کے لئے.........

خیر اندیش / ممتاز راشد لاہوری

پیارے حسن عباسی صاحب

سلام مسنون: مزاج عالی!

''ارژنگ کا تازہ شمارہ ملا۔ بے حد طمانیت کا احساس

ہوا۔ میں نے اس میں معروف شاعر اور نعت خوان جناب علی رضا کا مصاحبہ پڑھا۔ میرے شہر سے متعلق کی وجہ سے ظاہر ہے اس میں دل چسپی کا خاصا مواد تھا۔ یوں بھی علی رضا میرے کالج کے زمانے کے دوست ہیں۔ تعلقات میں نشیب و فراز کے باوجود ان کے ساتھ وضع داری کا سلسلہ قائم رہا ہے۔ وہ ایک مخلص اور بے ریا آدمی ہیں۔ میں زندگی کے متعدد امور میں انہیں خود سے بہت بہتر سمجھتا ہوں۔ اس لحاظ سے یہ مصاحبہ شان دار ہے۔ آپ نے حق بجق دار رسید والا کام کیا ہے۔

اللہ آپ دونوں کو سلامت رکھے۔

آپ کا بھائی

ڈاکٹر محمد افتخار شفیع

محترم حسن عباسی صاحب

آداب ستمبر کا "ارژنگ" اپنی تمام تر رعنائیاں لے کر جلوہ افروز ہوا ہے۔ جس میں آپ کی سلیقگی اور ہنر مندی نظر آ رہی ہے۔ ارژنگ کی ضخامت اور پرچنگ کا معیار پہلے سے خاصہ بہتر ہے تاہم علی رضا کا انٹرویو اور خورشید بیگ میلسوی کا مضمون خاصہ متاثر کن تھا۔ علی رضا کا تفصیلی انٹرویو مستقبل کے محقق اور تاریخ کے سٹوڈنٹ کے لیے بہت سی آسانیاں پیدا کرے گا۔ کسی بھی ادبی رسالے کا تواتر کے ساتھ چھپنا آسان کام نہیں ہے۔ آپ کی ہمت کو داد دینا ضروری ہے۔ مولا سلامت رکھے۔ دعا گو

خالق آرزو/ساہیوال

برادرم حسن عباسی

امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے

ارژنگ ملا، سرورق سے فسوں سا طاری ہو گیا، سرورق سے پوری جمالیات کے ساتھ پنجاب کی ثقافت جھلکتی ہوئی نظر آ رہی ہے، ساتھ ہی یہ گزارش کرتا چلوں کہ سرورق پر مسلسل اشاعت کا 18 واں سال اور شمارہ جولائی لکھا ہوا ہے، جبکہ اندرون کے پہلے فہرست والے صفحے پر مسلسل اشاعت کا 17 واں سال جبکہ شمارہ مئی لکھا ہوا ہے۔ کمپوزنگ کی ایسی غلطیوں پر غور ضروری ہے۔ باقی کمپوزنگ کی اغلاط ہوتی رہتی ہیں، قابو پالیا جائے تو بہتر ہے تخلیقات آپ کے عمدہ ادبی ذوق کی آئینہ دار ہیں۔ خالد شریف سے گفتگو حاصل ارژنگ ہے، منصور آفاق نے اپنے انٹرویو میں ظفر اقبال کے لہجے کو اپنے زمانے کا اجتماعی لہجہ قرار دیا ہے۔ جناب رسالت مآب ؐنے شعر کو حکمت سے تعبیر فرمایا ہے، اور شعریات ظفر اقبال میں حکمت کوئی ڈھکی چھپی ہوئی چیز نہیں۔ بقول ظفر اقبال

بدن کا نچلا حصہ اس قدر بے چین سا کیوں ہے
کوئی کیڑا گھسا ہوگا غرارا کھول کر دیکھو

یہ اور اس طرح کے سیکڑوں حکمت بھرے اشعار جناب کی شاعری میں موجود ہیں۔ ارژنگ میں افتخار ساجد کی شاعری دل کو کھینچتی ہے برادرم اسد اعوان کا لہجہ اک مرد مومن کا لہجہ ہے، اسد اعوان ہمیشہ سچ کا علمبردار رہا، نئی زمانہ ایسے لوگ کم ہوتے ہیں، بقول پنجابی شاعر الطاف حسین کرتوانہ کے،

سچ ہے دی دم
کوڑ دے پچھے جگ

آصف ثاقب کی تخلیقات ارژنگ کے حسن میں اضافہ اور معنویت میں گہرائی پیدا کر رہی ہیں، آصف ثاقب لفظ سے معجزہ کر دکھاتے ہیں۔

حافظ مظفر محسن، احمد عدنان طارق پر اپنے مضمون میں لکھنا چاہتے تھے مگر احمد عدنان طارق تک آتے آتے ان کا مضمون ہی ختم ہو گیا ہے، ناز بٹ، اور تفاخر محمود گوندل کے مضامین اپنے اپنے موضوعات کے حوالے سے اچھے ہیں، نیلم احمد بشیر، نادیہ احمد بشیر، تسنیم کوثر اور سعدیہ بتول کے افسانے اچھے لگے ہیں۔ مجموعی طور پر ارژنگ اچھا کام کر رہا ہے۔ لیکن خطوط کا حصہ انتہائی کمزور ہے، رواجی خطوط شامل ہی نہ کریں تو بہتر ہے۔ وہ خطوط شامل کریں جو ارژنگ کی تخلیقات پر لکھے گئے ہوں ارژنگ بھجوانے کے لیے بہت شکریہ!

اپنی اور کچھ دوستوں کی تخلیقات روانہ کر رہا ہوں، امید ہے کہ آپ کو ارژنگ کے لیے پسند آئیں گی۔ آپکا بہت زیادہ

اسد عباس خان/فتح پور پرتی

محترمی حسن عباسی صاحب تسلیمات!

امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ گزشتہ دنوں چالیس غزلیں ارسال کی تھیں۔ فون پر بات ہوئی اب تین (ایک نظم اور دو غزلیں) بھیج رہا ہوں تاکہ آپ تین مرتبہ پڑھیں اور امید ہے کہ آپ انہیں مکمل تین مرتبہ شائع کریں گے۔

شکیب جلالی کا ایک شعر سنیے

وہ ایک رات کہ جب روشنی علیل رہی
وہ ایک رات بعد انتشار گزری ہے

آپ کا بے حد مخلص/نعمان احمد ہاشمی

لاہور

مسقط میں مقیم ممتاز شاعر اور افسانہ نگار

ناصر معروف

سے حسن عباسی اور علی رضا کی گفتگو

ہر تخلیق کار کے اندر کسی دوسرے سے متاثر ہونے کا جذبہ ہمیشہ رہتا ہے

شاعری اس زمانے سے شروع کی جب آنکھوں کو شوخ رنگ بھلے لگتے تھے

ہم سوشل کلب کے زیر اہتمام کئی ادبی پروگرام کروا چکے ہیں اور مستقبل میں بھی کئی بڑے ادبی مشاعرے کروانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ارژنگ: کچھ اپنے بارے میں بتائیں۔

ناصر معروف: ساہیوال میں پیدا ہوا، ابتدائی تعلیم بھی ساہیوال میں ہی حاصل کی، گریجوایشن گورنمنٹ اسلامیہ کالج کراچی سے پاس کیا 2003 میں دیارِ غیر آ گیا، کچھ عرصہ دوبئی میں رہنے کے بعد مستقل طور پر سلطنت عمان میں سکونت اختیار کر لی۔

ارژنگ: شاعری کب شروع کی؟

ناصر معروف: جی شاعری اس زمانے سے شروع کی جب آنکھوں کو شوخ رنگ بھلے لگتے تھے۔ چاند راتوں کو جاگنا اچھا لگتا تھا۔ جب گھٹاؤں کی گھن گرج سے دل کی دھڑکن مہمیز ہوتی تھی۔

ارژنگ: آپ نے نظم کی نسبت غزل کو کیوں اظہار کا وسیلہ بنایا؟

ناصر معروف: غزل کو ذریعہ اظہار بنانے میں میری شعوری کوشش کارفرما نہیں تھی، نظم ایک اچھا وسیلہ اظہار ہے "پر طبیعت ادھر نہیں آتی" میرے خیال میں غزل میں کوئی طلسماتی کشش موجود ہے جبھی تو غزل نے صدیوں سے ہزاروں سخن وروں کو اپنے حصار میں لیا ہوا ۔ یہ صنفِ سخن بڑی سخت جان ہے۔

ارژنگ: ادبی گروہ بندیوں کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

ناصر معروف: ادبی گروہ بندیوں کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی اردو شاعری کی ہے، اختلاف انسانی سرشت میں موجود ہے۔ ہم نے اسی اختلاف کو تعمیر کے لیے صرف کرنا ہے نہ کہ تخریب کے لیے صحت مند ذہن رکھنے والوں کی ادبی گروہ بندیوں سے ادب کو فائدہ ہوا ہے۔ ہاں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو "اختلافِ رائے" کا مطلب "ذاتی توہین" سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو معاشرہ قبول نہیں کرتا۔

ارژنگ: کیا آپ بھی کسی شاعر سے متاثر ہوئے ہیں؟

ناصر: میں سمجھتا ہوں کہ ہر تخلیق کار کے اندر کسی دوسرے سے متاثر ہونے کا جذبہ ہمیشہ رہتا ہے۔ شاید یہی جذبہ اس کے تخلیقی سفر کو آگے بڑھاتا ہے۔ میں بھی اپنے فنی سفر کے مختلف ادوار میں مختلف شعراء سے متاثر ہوتا رہا ہوں جن میں سرفہرست مجید امجد، ناصر کاظمی، فیض احمد فیض، جون ایلیا، اور احمد فراز شامل ہیں۔

ارژنگ: افسانہ نگاری کب شروع کی؟

ناصر: تخلیقی سفر میں کبھی ماہ و سال کا حساب نہیں رکھا، کیا کسی کو یاد ہے کہ اس نے کب بولنا شروع کیا تھا۔۔۔ نہیں نا۔۔۔ بس ایسے ہی یاد نہیں کہ پہلا افسانہ کب لکھا تھا۔۔۔ ہاں بس اتنا یاد ہے کہ اندر کی کہانیاں جب لفظوں اور مکالموں کا لبادہ اوڑھ کر کمرے میں چہل قدمی کرنے لگیں تو افسانہ میری انگلی پکڑ کر مجھے "سنڈے میگزین" تک لے گیا۔

ارژنگ: کس قسم کے موضوعات افسانہ لکھنے پر اکساتے ہیں۔

ناصر معروف: عموماً وہ سماجی و معاشرتی مسائل جو ایک عام آدمی کو براہ راست متاثر کرتے میرے افسانے کا موضوع ہوتے ہیں۔

ارژنگ: افسانہ نگاری میں کس سے متاثر ہوئے۔

ناصر: میں افسانہ نگاری میں احمد ندیم قاسمی اور اشفاق احمد سے بہت متاثر ہوا ہوں ۔ ان کو میں جب بھی پڑھتا ہوں خیال و فکر کے نئے دریچے مجھے پر وا ہوتے ہیں۔ ان کے افسانے لطف بھی دیتے ہیں اور لکھنے والوں کی تربیت بھی کرتے ہیں

ارژنگ: مسقط کا ادبی منظر نامہ آپ کے نام کے بغیر ادھورا ہے۔ آپ ہمیشہ ادبی تقریبات کے روحِ رواں رہتے ہیں سود و زیاں کے اس دور میں آپ نے یہ "گھاٹے" کا سودا کیوں کیا۔ آپ خاموشی سے شعر کہہ سکتے تھے۔

ناصر: جی آپ نے درست کہا جو لوگ ادبی ذوق سے محروم ہیں ان کی نظر میں یہ "گھاٹے" کا سودا ضرور ہے لیکن میرے لیے تو یہ ادبی تقریبات "آکسیجن" کا کام دیتی ہیں۔ لوگوں کے ادبی ذوق کی نمو ہوتی ہے، ادب کی خدمت ہوتی ہے، لوگوں سے میل ملاپ بڑھتا ہے۔ دیارِ غیر میں پروان چڑھنے والی نئی نسل جو الیکٹرونکس ڈیوائس کی رسیا ہے۔ ان کو ادبی تقریبات میں لا کر حرف و فکر سے جوڑتا ہوں۔ میرے لیے خیال میں ان میں سے کوئی بھی مقصد ایسا نہیں ہے جس کو نظر انداز کیا جا سکے۔

ارژنگ: تخلیقی محاذ کے علاوہ اور کس محاذ پر آپ برسرِ پیکار ہیں۔

ناصر معروف: شاعری اور افسانے کے بعد سیاحت میرا جنون ہے۔ اللہ کے کرم سے اور والدین کی دعاؤں سے آدھی دنیا پھر چکا ہوں۔ خدا کی بنائی ہوئی دنیا بہت خوب صورت ہے۔ بے پناہ کاروباری مصروفیت کی وجہ سے خود کو افسانے اور شاعری تک محدود رکھا ہوا ہے۔ طبیعت بہت مچلتی ہے کہ سفر نامہ تحریر کروں۔۔۔ بس خود کو روکا ہوا ہے

ارژنگ: آپ کی نظر میں ادبی رسائل اور ادبی ایڈیشن کس حد تک ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔

ناصر معروف: میں مثبت سوچ کا حامل شخص ہوں بات کا روشن پہلو ہی دیکھتا ہوں۔ ان ادبی رسائل اور ادبی ایڈیشن سے کچھ شکایات ضرور ہو سکتی ہیں لیکن پھر بھی کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔ ان ادبی رسائل کو کم ہی لوگ خرید کر پڑھتے ہیں۔ ان کی اشاعت مالی نقطہ نظر سے سراسر گھاٹے کا سودا ہے لیکن پھر بھی جو لوگ اس کارِ خیر میں مصروف ہیں وہ یقیناً تعریف و تحسین کے لائق ہیں۔ یہ ادبی رسائل کسی نہ کسی حد تک تو عہدِ حاضر کے شعراء کو صفحہ قرطاس پر محفوظ کر رہے ہیں۔ یہ ایک قابلِ تحسین اور قابلِ تقلید عمل ہے

ارژنگ: عمان کی ادبی سرگرمیوں کے بارے میں کچھ بتائیں۔

ناصر معروف ۔ عمان میں میں "پاکستان سوشل کلب" کے لٹریری ونگ

بقیہ اندرونی صفحات

سماجی وادبی تنظیم ''راستی'' کے زیر اہتمام

پاک ٹی ہاؤس میں عامر بن علی کے اعزاز میں ظہرانہ ومشاعرہ

صدارت : نیلما ناہید درانی • مہمانانِ خصوصی : عامر بن علی • سید زاہد عباس • نظامت : حسن عباسی

محفل مشاعرہ سے پیشتر غیر رسمی گپ شپ کا منظر

آغا علی مزمل اپنا کلام سناتے ہوئے

شعرائے کرام : فراست بخاری • طارق بٹ • علی رضا • انیس احمد • عرفان صادق • ریاض ہانس • ارسلان ارسل • علی رضا کاظمی • ثمینہ سید • انمول گوہر

Design By.
MUHAMMAD AHSUN Gull

Read Arxang Online
www.amirbinali.com
www.millat.com